www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2022 ، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 09 ستمبر 2022

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر: ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

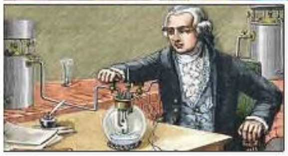

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	مضامین	
مشقت کی قیمت	سیدہ نوشاد بیگم محمود	06
جھوٹ: معاشرے کی دیمک	ریاض ارتکلی	08
	یوم اساتذہ	
مثالی استاد کون؟	جرار احمد	10
یوم اساتذہ	شرمین انصاری	12
	انٹرویو	
میں نے اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھا ہے: نذیر فتح پوری		16
	نظمیں	
مزدور ماں کی لوری	راشد جمال فاروقی	19
ای۔علم	ابواللیث جاوید	20
احتیاط	محمد رفیع انصاری	21
پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے	رفیق گلاب	22
ماہیے	ارشاد احمد ارشاد	23
روز اسکول جائیں گے ہم	کلیم رہبر	24
	بچوں کے بڑے ادیب	
دیویندر ستیارتھی	ندیم راعی مرادآبادی	25
	کہانیاں	
پھر نیا سوال	محمد اسداللہ	28
راستہ دکھا دیا	تنویر اختر رومانی	31
سراب	محمد الیاس	33
غلط راستے کا مسافر	جہانگیر انس	36
سفر مسلسل	شاہ تاج خان	40
ننھی کھلونے والی	تفضّل جمال	44
ریان اور طوطا	شاداب ابراہیم	47
باغبان	ناہید ندیم	49
	بچوں کا کتب خانہ	
الفاظ ہند	حقانی القاسمی	51
	سائنس نامہ	
لے وائسرائے کے کارنامے	سید شہاب الدین دسنوی	53
	صحت اطفال	
ملیریا	کپتان لطافت حسین خان (علیگ)	57
	زبان شناسی	
لفظوں کو ملا کر لکھنا		59
	ننھے فنکار	
پینٹنگ		61

پیارے بچو! 5 ستمبر کو یوم اساتذہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن اسکولوں میں مختلف تعلیمی اور ثقافتی پروگرام ہوتے ہیں۔ بچے اپنے اساتذہ کو گلدستے اور تحائف پیش کرتے ہیں۔ 5 ستمبر کو یوم اساتذہ کے طور پر اس لیے مخصوص کیا گیا کیونکہ 5 ستمبر 1888 کو ماہر تعلیم اور ہندوستان کے دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن پیدا ہوئے تھے۔ جب وہ ملک کے صدر جمہوریہ منتخب کیے گئے تو ان کے دوستوں اور شاگردوں نے ان کا یوم پیدائش منانے کی درخواست کی، جس پر انھوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میری پیدائش کے دن کو یوم اساتذہ کے طور پر منایا جائے تو اس سے مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔

پیارے بچو! والدین کے بعد اساتذہ ہی ہیں جو بچوں کے مستقبل کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ بچوں کی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں اور ناکامی پر افسردہ ہوتے ہیں۔ ہر استاد چاہتا ہے کہ اس کا طالب علم والدین، اساتذہ اور ملک وقوم کا نام روشن کرے اور علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کرے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے اساتذہ کی عزت کریں۔ ان کا احترام کریں۔ ان کا کہنا مانیں۔ ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چلیں۔ آپ ان سے نہ الجھیں۔ ان کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک نہ کریں۔ ان کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہ کریں۔ وہ ہمیشہ آپ کی صحیح رہنمائی کریں گے جس سے کہ آپ ہر میدان میں سرخرو ہوں گے اور کامیابی وکامرانی آپ کے قدم چومے گی۔

پیارے بچو! اساتذہ ہی ہیں جو آپ کو تعلیم کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں اور تعلیم ہی کسی بھی قوم اور ملک کی ترقی کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی شخصیت کی تعمیر ممکن ہے اور اسی سے سماج اور معاشرے میں خوش نما تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر مذہب نے حصول تعلیم اور اس کی اہمیت وافادیت پر زور دیا ہے۔ اس سے بھی اساتذہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آج کے نازک وقت میں اساتذہ کی ذمے داری پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ آج کل نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سی تبدیلیاں رونما ہوگئی ہیں اور بچے ان سے بے حد متاثر بھی ہیں۔ کتابوں کی جگہ موبائل نے لے لی ہے جس کی وجہ سے بچوں کا اچھا خاصا وقت موبائل ہی میں صرف ہوجاتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کے لیے لازمی ہے کہ بچوں کو کتابوں کی طرف مائل کریں کیونکہ کتابیں ہی انھیں صحیح راستہ دکھاسکتی ہیں۔

یوم اساتذہ کی مناسبت سے کچھ نگارشات 'بچوں کی دنیا' میں شامل کی گئی ہیں۔ 'چمن چمن کے پھول' میں بھی تعلیم، استاد اور شاگرد کے حوالے سے خوب صورت اور معیاری اشعار دیے گئے ہیں۔ آپ انھیں پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں اساتذہ کی کتنی قدر ومنزلت ہے اور کیا مقام ومرتبہ ہے۔ ہم چاہے کتنی ہی بلندی پر پہنچ جائیں لیکن اپنے استادوں کی شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے کیونکہ ان کی شفقتیں اور محبتیں ہی ہمارے لیے مشکل راہوں کو آسان کرتی ہیں اور ہمارے لیے صحیح منزل کا انتخاب کرتی ہیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

ہندوستان بھر سے بچوں کے رسالے نکلتے ہیں سرکاری سطح پر اور غیر سرکاری سطح پر۔ سرکاری سطح پر شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں 'بچوں کی دنیا' کا مقام طباعت، اشاعت مواد، ترتیب، تزئین و پیشکش کے لحاظ سے بہت ہی عمدہ ہے۔ خاص طور پر ماہ کے اعتبار سے اس موضوع کی کہانیاں، اور نظمیں ہوتی ہیں۔ ماہ اگست یوم آزادی کے لحاظ سے آزادی پر نثر و نظم میں چھ تخلیقات ہیں۔ موسم برسات پر بھی نظمیں ہیں۔ مضامین میں خواجہ عبدالمنتقم کا مضمون 'لفظ بچہ کی قانونی تعریف...' خوب ہے۔ یہ نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی معلومات میں اضافہ ہے۔ 'ڈاکٹر ذاکر حسین: بھارتی نظام تعلیم کے اہم ستون' عمدہ مضمون ہے۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا جو گھر تھا اس محلے کا نام 'بیگم بازار' آج شہر کا بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ 'سمبل' اور 'بانس' پر بھی کافی معلوماتی مضامین ہیں۔

پندرہ اگست آج پھر آیا ہے دوستو
آزادی کے گیت آج پھر لایا ہے دوستو

آزادی پر عائشہ سمن، خلیق الزماں نصرت، خالد سرحدی، شکیب تائب کی نظمیں خوب ہیں۔ بچوں کی نفسیات پر انٹرویو کچھ پھیکا ہے۔ ہندوستان بھر کے رسائل پر بھی نظر ہو، جنوبی ہند سے ایک یا دو رسالے نکلتے ہیں وہ بھی کبھی، اردو اکیڈمی تلنگانہ کا رسالہ 'روشن ستارے' بند ہو گیا۔ اسے جاری ہونا چاہیے۔ برسات پر نظمیں اچھی ہیں۔ دیگر نظم و نثر پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہ نہ صرف بچوں کی دنیا ہے بلکہ بڑوں کی دنیا بھی ہے۔ اتنی کم قیمت میں ایسی معلومات شاید ہی کوئی رسالہ دے گا۔ نیک خواہشات!

ڈاکٹر م ق سلیم، صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

بچوں کی دنیا جولائی کے شمارے کا اداریہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ بچے اب بڑوں کی عزت نہیں کرتے۔ ایک زمانہ تھا کہ چھوٹے بڑوں کی بہت عزت کرتے تھے یہاں تک کہ ان کے بیٹھنے کے جگہ بھی چھوڑ دیتے اور تیز آواز میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ میری گذارش ہے کہ ڈاک خانہ کے لیے کم از کم دو تین صفحات رکھیں تا کہ میگزین کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ شمارے میں سید شمیم احمد مدنی کا مضمون 'کولمبس کی کھوج امریکہ' بہت ہی اچھا۔ 'ڈیجیٹل دوستی' وسیم سعید کی پسند آئی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انٹرویو بچوں کے لیے عام فہم کتابیں ان کے ذہنی و فکری ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ نظم سنسار کل یہ سارا بچو تمھارا ہوگا اچھا لگا۔ سلیم خان کی کہانی 'مینا کا پیغام' خوب ہے کہ اب جانوروں کو جنگل میں گھونسلہ بنانے کے لیے جگہ نہیں۔ جنگل کاٹ کر جنگلی جانوروں نے بستیوں میں آشیانے بنائے ہیں اس لیے مینا نے گھر میں ہی بچوں کے گھونسلہ بنایا ہے۔ ہمیں جانوروں کی بولی سمجھنا چاہیے۔ پرویز احمد یعقوبی کی 'دوستی' پسند آئی۔ افتخار انیس حمید کی کہانی 'مہا کنجوس'، زیب النسا کی 'ہار کے بعد جیت'، سعدیہ پروین کی 'عقلمند کسان' بہت اچھی لگیں۔ کہانی 'عقلمند کسان' پیغام یہ ہے کہ کسان کے بیٹے چاہیں تو محنت کے بل بوتے پر زمین سے سونا اُگا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تخلیقات بھی لائق مطالعہ ہیں۔

عبدالمجید مکرو، اروانی، کلگام، جموں و کشمیر

مضمون

سیدہ نوشاد بیگم محمود

مشقت کی قیمت

ہمیں بچوں سے لاڈ پیار ضرور کرنے چاہیے۔ ان کی تعریف بھی کرنی چاہیے۔ لیکن جب ہم اپنے گھروں کے کام انجام دیتے ہیں تب چھوٹے موٹے کاموں میں اُن کا تعاون بھی لینا ضروری ہے تاکہ انھیں مشقت کی قیمت معلوم ہو اور ہمیں بھی لگاتار محنت کرنے سے تھوڑا بہت آرام مل جائے۔ اس کے پیچھے یہی مقصد ہوتا ہے۔ بچوں کو مشقت کی قیمت اور اہمیت معلوم ہو اس لیے اس طرح کے کام اُن سے ضرور کروانا چاہیے۔ مشقت کرتے وقت ہمارے والدین یا گھر والوں کو جو تکالیف سہنی پڑتی ہے اس بات کا احساس اُنھیں بھی تو ہو۔

ایک واقعہ کے ذریعے اس بات کو سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اشرف نے ایک بڑی کمپنی میں انتظامی افسر کے عہدے کے لیے درخواست دی۔ اُسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ پہلا انٹرویو اُس نے بڑی عمدگی سے پار کیا۔ اُسے آخری انٹرویو کے لیے منتظم اعلیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ منتظم کی تجربہ کار نظروں نے یہ بات فوراً بھانپ لی کہ اُمیدوار کی قابلیت ثانوی درجے کی تعلیم سے ہی عمدہ رہی ہے۔ وہ کبھی ناکام نہیں رہا۔ اور نہ ہی اُس نے کبھی کم مارکس حاصل کیے ہیں۔ نگراں کار نے اُس سے سوال کیا بچے! کالج میں تو تمھیں ہمیشہ اسکالرشپ ملتی ہوگی؟ اُس نے بڑی انکساری سے نفی میں جواب دیا۔ ''تب نگراں کار نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ پھر تمھارے والد ایسے کون تھے کہ جنھوں نے بذاتِ خود تمھاری تعلیم کا خرچ برداشت کرلیا۔ نوجوان نے جواب دیا۔ میں جب ایک سال کا تھا تب میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ میری تعلیم کی مکمل ذمے داری میری والدہ نے برداشت کی۔

اچھا! پھر تمھاری والدہ کہاں ملازمت کرتی ہیں؟ نگراں کار نے سوال کیا۔ میری والدہ صاف صفائی اور کپڑے، برتن دھونے کا کام کرتی ہیں۔ نوجوان کے اس جواب کے بعد نگراں کار نے اُسے اپنا ہاتھ دکھانے کے لیے کہا۔ نوجوان کے ہاتھ بڑے ملائم اور نازک تھے۔ ''تم نے کبھی کپڑے دھونے میں اپنی ماں کی مدد کی ہے؟ نگراں کار کے اس سوال پر نوجوان نے کہا''، کبھی نہیں۔ کیونکہ میری والدہ چاہتی تھی کہ میں تعلیم حاصل کرتا رہوں۔ اور وہ بڑی تیز رفتاری سے کپڑے دھویا کرتی تھی'' اُس کے بعد منتظم اعلیٰ نے کہا'' آج گھر جانے کے بعد اپنی ماں کے ہاتھ صاف کرنا اور اُس کے بعد مجھ سے آ کر ملو۔''

منتظم کے مجموعی تاثرات سے نوجوان کو اس بات کو احساس ہوگیا کہ اسے یہ ملازمت ضرور ملے گی۔ منتظم کے کہنے پر گھر جاکر اُس نے اپنی والدہ کے ہاتھ صاف کیے۔ تب اُس نے دیکھا کہ میری والدہ کے ہاتھوں پر کام کرنے سے گھٹے پڑ گئے ہیں۔ چند جگہوں پر تو گہرے زخم بھی ہو چکے تھے۔ اُن زخموں کو پانی سے دھونے سے والدہ کو درد ہو رہا تھا اور اُس درد کی شدت سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اشرف کو یہ بات محسوس ہوئی کہ میری اسکول کی فیس بھرنے کے لیے روزانہ یہی ہاتھ کام کرتے تھے۔ مجھے ڈگری دلانے

کے لیے والدہ نے ہاتھوں پر ہوئے زخموں کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ میرے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے اُس نے خود کے سکھ کی قربانی دی تھی۔ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے اُس نے خود کپڑے دھوئے۔ رات کو بڑی دیر تک ماں بیٹے گفتگو کرتے رہے۔ صحیح معنوں میں اپنی سابقہ زندگی کی یادیں ہی یہ ماں بیٹے تازہ کر رہے تھے۔ دونوں کب نیند کی آغوش میں گئے اُنھیں معلوم بھی نہ ہوسکا۔

صبح بیدار ہونے کے بعد اُس کی محنت رنگ لائی۔ یہی خوشی ماں کے چہرے سے عیاں تھی۔ اور اشرف کا دل احسان مندی کے جذبے سے سرشار ہوگیا تھا۔ اشرف وقتِ مقررہ پر منتظم کے کمرے میں داخل ہوا۔ منتظم اشرف کی جانب گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اشرف بھی اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو روکنے سے ناکام رہا۔ ''کل گھر جاکر تم نے کیا کِیا اور حاصل ہوئے تجربے سے تم نے کیا سیکھا؟ یہ بات مجھے معلوم کرنی ہے۔ منتظم نے کہا تب اشرف نے جواب دیا'' میں نے اپنی والدہ کے ہاتھ صاف پانی سے دھوئے۔ اور اُن کے آگے رکھے ہوئے تمام کپڑے میں نے خود دھوئے۔'' تب منتظم نے کہا۔ نہیں، مجھے تمھارے احساسات جاننے ہیں مہربانی کرکے مجھے بتاؤ۔ اس کے بعد اشرف نے بڑی انکساری سے درج ذیل باتیں ظاہر کیں:

- ماں کی ممتا اور اُس کی قربانی سے واقفیت مجھے کل ہوئی، میری والدہ کی وجہ سے ہی آج میں ایک کامیاب نوجوان کے طور پر آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔
- کل ماں کے ساتھ کام کرنے سے اُس کی مدد کرنے سے میرے ذہن میں بات آئی کہ کوئی بھی کام متواتر کرنا کتنا دشوار گزار ہوتا ہے۔
- خاندانی رشتوں کی پہچان اور قیمت بھی مجھے معلوم ہوئی۔

اِن جوابات کو سننے کے بعد نگراں کار نے کہا۔ اشرف یہی توقع مجھے اپنے انتظامی افسران کی جانب سے ہے۔ مجھے ایسا ہی انتظامی افسر چاہیے جو دیانت داری سے کام کرنے والوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ اُن کی ستائش اور حوصلہ افزائی کرے۔ ایسا ہی افسر دوسروں کی جانب سے عمدہ کارگردگی کروا سکتا ہے۔ ہم یہ ملازمت تمھیں دے رہے ہیں۔

بعدازاں اشرف نے بڑی محنت اور لگن سے اپنے کام کی شروعات کی، اور اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے علاوہ ماتحت کام کرنے والوں سے بھی عزت و احترام حاصل کیا، اُس کمپنی کے ہر ملازم نے محنت، لگن اور مل جل کر کام انجام دیا۔ اس لیے اُس کمپنی کی کارگردگی اور معاشی ترقی بھی عمدہ ثابت ہوئی۔

بچوں سے بے جا لاڈ پیار نہ کریں۔ ہم اپنے بچوں کی متواتر حفاظت کرتے ہیں، نگہداشت کرتے ہیں اور ہمیشہ اُن کی مانگیں پوری کرتے ہیں تب اُن میں 'حق' کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمیشہ میرے حقوق مجھے ملتے رہیں یہ محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ اُن کی فطرت بن جاتی ہے۔ والدین کی محنت و مشقت کی قیمت وہ نہیں جانتے۔ اس وجہ سے وہ لاپرواہ اور بے فکر بنتے ہیں تب اُن میں ایک مخفی جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ اردگرد کے تمام افراد ہماری ہی باتیں سنیں اور مانیں۔ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

(فروری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ھے)

■

Syda Naushad Begum Mehmood
Shree Darshan Apt ,
B/201, Mumbai Pune Road,
Shastri Nagar Kalwa 400605 (Maharashtra)
Dist. Thane
Mob.: 9867650210

جھوٹ: معاشرے کی دیمک

ریاض انکلی

چار حرفی لفظ 'جھوٹ' کا استعمال ہر دور میں ہوتا رہا ہے، لیکن موجودہ دور میں جھوٹ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کیا جارہا ہے۔ جو ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر رہا ہے اور ہم اس پر توجہ بھی نہیں دے رہے ہیں۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے فائدے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لیے آج میں لفظ جھوٹ کے چند اہم نکات پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایسی باتیں جو سچ نہ ہوں لیکن جھوٹ بولنے والے کی ادائیگی سے سچ کا گمان ہو۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جھوٹ نے 90 فیصد افراد کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ ان میں سے چند افراد جھوٹ کو اپنے بچاؤ یا پھر اپنی کسی کمزوری کو چھپانے کے لیے بول جاتے ہیں۔ ایک سچ پر پردہ پوشی کے لیے کئی جھوٹ بول کر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جھوٹ کو خواہ کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ جھوٹ بول کر اپنی بات کو سچ ثابت کرنا ایسی بری عادت ہے جو انسان کو گناہ کے دلدل میں پہنچا دیتا ہے جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کسی بھی مذہب یا معاشرے میں جھوٹ کو صحیح نہیں کہا گیا ہے، لیکن پھر بھی لوگ جھوٹ بول کر خود کو گنہگاروں میں شامل کر لیتے ہیں۔ جھوٹ انسان کی شخصیت کو داغدار کر دیتا ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔ جب کسی جھوٹے کی سچائی سامنے آتی ہے تو اسے ذلیل و خوار بھی ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے درمیان اس کی عزت نہیں رہتی ہے۔ جھوٹ بول کر وقتی طور پر کسی کو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے لیکن اس کا اثر تادیر قائم نہیں رہتا ہے۔ جھوٹے انسان کی سچائی جب عیاں ہوجاتی ہے تو اس کا سکون وچین بھی اس سے دور ہوجاتا ہے۔ جھوٹے انسان کی باتوں سے اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔ جھوٹ کی کئی اقسام ہیں جیسے اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے برتر و بالا ثابت کرنے کے لیے، اپنے مفاد کی تکمیل کے لیے، دھوکہ دے کر کچھ حاصل کرنے کے لیے، جھوٹ بول کر سبز باغ دکھانے کے لیے، جھوٹ کا سہارا لے کر اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے۔

جھوٹ بولنے والے ایک نوجوان کی سچی کہانی پیش خدمت ہے۔

صنعتی شہر کے دھرم پلی محلّہ کا ایک نوجوان شیخ محمد عامر

بہترین لباس زیب تن کر کے ہر صبح گھر سے دفتر جانے کے نام سے نکلتا اور شام کو گھر لوٹ آتا۔ محلے کے دوسرے نوجوان اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور آپس میں باتیں کرتے کہ دیکھو عامر کو کتنی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ کچھ نوجوان اس سے حسد کرنے لگے۔ عامر سے کوئی اس کے دفتری کام کے سلسلے میں پوچھتا تو بڑے فخر سے کہتا کہ وہ ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر کے عہدے پر فائز ہے جہاں ہر روز اس کے ٹیبل پر بڑے بڑے لوگوں کی فائلیں دستخط کے لیے آتی ہیں۔ اگر وہ ان فائلوں پر دستخط نہیں کرے تو ان کا کام رک جائے۔ ہر روز شام کو محلے میں یہاں وہاں بیٹھ کر ڈینگیں ہانکنا عامر کے معمول میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ صبح سویرے گھر سے نہیں نکلا تو اس دن کئی لوگ اس کے دروازے پر پہنچ گئے اور پیسے لوٹانے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے، کچھ تو زور زور سے دھمکانے بھی لگے۔ ان لوگوں کی آواز سن کر پڑوسی اپنے اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں سننے لگے۔ محلے کے کچھ نوجوان جن کے سامنے وہ ڈینگیں ہانکتا تھا شور وغل سن کر پہنچ گئے۔ تب محلے کے ان نوجوانوں کو پتہ چلا کہ عامر کسی دفتر میں نوکری نہیں کرتا بلکہ شہر کے لوگوں کو اپنے لباس اور جھوٹی باتوں سے مرعوب کر کے ان سے پیسے ٹھگنے کا کام کرتا رہا ہے۔ آج اسے اس کے جھوٹے وعدے سے اپنے ہی گھر کے دروازے پر محلّہ والوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔ عامر محلے کے لوگوں کے سامنے سر جھکائے تقاضا کرنے والوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ندامت سے وہ سر اٹھا کر کسی سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں تھا۔

بقول پروین شاکر

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

لیکن شاید ایسے شخص کو معلوم نہیں کہ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے جس کی ممانعت سختی سے آسمانی صحیفوں میں بھی کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کے چہرے کی رونق وحسن ختم ہو جاتا ہے جھوٹ ہر بُرائی کی جڑ کہلاتا ہے۔ تمام مذاہب عالم میں جھوٹ کو بدترین گناہ اور بڑا عیب قرار دیا گیا ہے۔ ■

Md. Reyazuddin (Reyaz Utkali)
Rangapara, Haji Syed Faried Nagar
Post: Dharampur
Burnpur - 713325
Distt.: Paschim Burdwan (West Bengal)
Mob.: 9832913500

یوم اساتذہ

مثالی استاد کون؟

جرار احمد

وقت کے ساتھ تبدیلی فطرت کا قانون ہے۔ پیارے بچو! زندگی کے ہر شعبے میں لوگ اپنی صلاحیت کے اعتبار سے کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ملک وقوم کی ترقی کے لیے تجارت اپناتے ہیں تو کچھ لوگ محنت و مزدوری کرتے ہیں بلکہ یوں کہہ لیں ''نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں'' اسی طرح کچھ لوگ درس وتدریس کے ذریعے سماج کی تربیت کرتے ہیں۔ اس کو مقدس پیشہ مانا جاتا ہے۔ اساتذہ قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ کوٹھاری کمیشن نے کہا تھا کہ ''ملک کا مستقبل کلاس روم میں سنور رہا ہے۔''

تدریس ایک اعلی صفات کا حامل پیشہ ہے۔ ''اور اللہ تعالی نے آدم کو تمام (اشیا کے) نام سکھائے'' (قرآن) اس طرح حضرت آدم کو اللہ نے سکھایا۔ تعلیم وتدریس میں سیکھنے سکھانے کا عمل ہوتا ہے اور سکھانے والا استاد کہلاتا ہے، گویا رب کائنات حضرت آدم کا استاد ہوا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا'' اور اس کے بعد اصحاب صفہ کی ایک تاریخ ہمارے سامنے ہے، جہاں پر دنیا کے مختلف گوشے سے صحابہ کرام آکر علم حاصل کرتے اور پھر واپس جا کر اسلام کی تعلیم کو عام کرنے میں لگ جاتے۔ تدریس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہر دور میں اساتذہ سے اچھی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور ہر کوئی یہ سوچتا ہے کہ استاد کا مطلب فرشتہ یعنی تمام برائیوں سے پاک و صاف ایک مثالی شخصیت ہی استاد کہلا سکتی ہے۔ مثالی استاد کی خوبیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخصی اعتبار سے اور دوسرا درسی اعتبار سے۔ یعنی معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت سے اس کی شخصیت کیسی ہونی چاہیے اور دوسرے یہ کہ مضمون کے اعتبار سے اس کی معلومات کیسی ہونی چاہیے۔ یہاں دونوں خوبیوں کو مجموعی طور سے بیان کیا جا رہا ہے۔

مثالی استاد وہ جو حق اور سچ بات بولے، استاد کا دل ناامیدی سے پاک اور اس کی زبان بے باک اور جرات مند ہو۔ حتی کہ لوگ اس کی صاف گوئی کی مثال دیں۔ ہمارے سماج میں ایسے لوگوں کی تعداد بے شمار ہے جن کا گزر بسر جھوٹ پر ہی ہوتا ہے، اس لیے نہ جھوٹ بولے اور نہ دوسروں کو جھوٹ بولنے دے۔

مثالی استاد ایسا ہو جو ہر بات میں خیر کی تلاش کرنے والا ہو۔ اکثر لوگ تھوڑی سی بات پر یا کسی کی کامیابی پر غلط بات کہنے لگتے ہیں ایسا نہ تو خود کہنا چاہیے اور نہ ہی دوسروں کو کہنے دینا چاہیے، بلکہ ہر بات میں بھلائی اور مثبت پہلو استاد تلاش کرے اور اسی کی ترغیب طلبا کو بھی دے۔ حالات جیسے بھی ہوں بلا تفریق ہر کسی کے ساتھ بھلائی کرے۔ ایسا نہ ہو کہ رشتے داروں اور دوستوں تک ہی بھلائی محدود رہے۔ عداوت، غصہ، اور حسد کے ساتھ کوئی شخص مثالی استاد نہیں بن سکتا۔ معاشرے میں دھوکہ، جھوٹ، دغا تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اساتذہ اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ہر کسی کے ساتھ اچھے سے پیش آئیں کسی کے لیے دل میں کینہ، کدورت وغیرہ نہ رکھیں۔

جب یقین پختہ ہے تو کام آسان ہوتا ہے۔ ایک مثالی استاد ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے پاک وصاف ہو۔

ہمیشہ اپنے طلبا، معاشرے، پڑوسیوں اور عالم انسانیت پر احسان کرنے والا، عدل کا داعی ہونے کے ساتھ سماجی برائیوں سے پاک ہو۔ معاشرے میں اخوت قائم کرنے والا ہو۔ وقت کا پابند اور صحیح استعمال کرنے والا ہو۔ اپنا کام پوری نیک نیتی اور ایمانداری سے کرتا ہو۔ طلبا کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہو۔ مددگار، مسئلے کا حل اور صحیح راہ دکھانے والا ہو۔ بہتر معاملات، امانت دار، صلہ رحمی، صحت مند، خوش لباس و خوش مزاج ہو۔

ایک مثالی استاد اپنے طلبا کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے باخبر رہتا ہے، ان کی ذہنی صلاحیت، عمر، رویے اور سوچ و فکر سے واقف رہتا ہے۔ اسے معلوم رہتا ہے کس طالب علم کے لیے کون سی بات مشکل ہے اور کس کے لیے آسان، کون سا طالب علم ذہنی طور سے کلاس میں موجود ہے کون نہیں۔

ایک مثالی استاد کی گفتگو صاف ستھری، سادہ اور سہل ہونی چاہیے موضوع کی مکمل سمجھ کے لیے الفاظ کا انتخاب، مختصر جملوں کے علاوہ جملوں کی خاص ترکیب سے طلبا کسی بھی ذہنی پریشانی اور الجھن سے محفوظ رہتے ہیں۔ مثالی استاد کا کلام ہمیشہ مختصر اور مدلل ہونا چاہیے۔ ایک مثالی استاد طلبا کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ روزگار کے لائق بن سکیں۔

مواد مضمون اور زبان پر عبور کے ساتھ بات کو صحیح ڈھنگ سے بچوں کو سمجھانے کی صلاحیت کا ہونا ایک مثالی استاد میں بے حد ضروری ہے اکثر طلبا کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے استاد کے پاس معلومات بہت ہے، لیکن وہ اپنی بات صحیح طریقے سے سمجھانے کا ہنر نہیں رکھتے۔ کچھ استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس معلومات کم ہونے کے باوجود طلبا کو سمجھانے پر قادر ہوتے ہیں، طالب علم کے دل میں اتارنے کا فن ایک استاد کے لیے بے حد ضروری ہے۔

پیارے بچو! مثالی استاد معلوماتی اور مواصلاتی ٹکنالوجی سے نہ صرف واقفیت رکھتا ہو بلکہ وقت ضرورت اس سے متعلق تمام امور کی انجام دہی بحسن وخوبی کرتا ہو۔ کووڈ وبا کے بعد حالات نے جو کروٹ لی ہے اور تعلیمی منظرنامہ جس تیزی کے ساتھ بدلا ہے اور ہم اپنے زیادہ تر کام آن لائن کرتے ہیں ایسے میں مثالی استاد کی خصوصیات بھی بدلی ہیں مثلا اکیسویں صدی کے مثالی استاد سے یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ ٹائپنگ جانتا ہو اور اپنے تمام کام جیسے مقالے، رپورٹ وغیرہ خود سے تیار کرتا ہو ساتھ ساتھ لیکچر کے لیے پاور پوائنٹ بنانے پر بھی قادر ہو۔ گوگل کلاس روم کی باریکیوں سے واقف ہو، گوگل کلینڈر کا موثر طریقے سے استعمال کرتا ہو۔ اسی طرح سے گوگل کے دوسرے آلات جیسے ڈرائیو، شیٹ، فارم، کیپ، سلائڈ وغیرہ کا استعمال اچھے طریقے سے جانتا ہو۔ نئے اور ڈیجیٹل طریقِ تدریس کی معلومات و فہم رکھتا ہو۔ طلبا کے درمیان تعلقات کو ہموار کرنے والا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ٹکنالوجی تو ٹیچر کا بدل نہیں ہوسکتی لیکن وہ ٹیچر جو ٹکنالوجی نہیں جانتے، ان کا بدل ٹکنالوجی جاننے والے اساتذہ ہوسکتے ہیں۔

استاد معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں لاکر زندہ جاوید ہوجاتا ہے۔ پیارے بچو! اگر آپ اپنے نقوش دنیا پر چھوڑنا چاہتے ہیں اور ایک مثالی اور باکمال استاد بننا چاہتے ہیں تو مذکورہ تمام اوصاف کے ساتھ اس جیسی تمام صفات کو اپنے اندر جذب کرلیں اور اپنی زندگی کو انہی طریقوں پر بسر کریں تو یقیناً آپ بھی ایک مثالی استاد بن جائیں گے اور آپ کا نام بھی جاوداں ہوجائے گا۔

■

Dr. JarrarAhamad
Asst. Prof Dept.of Education and Training
MANUU,Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 9618783492
Email.: jarrar@manuu.edu.in

شرمین انصاری

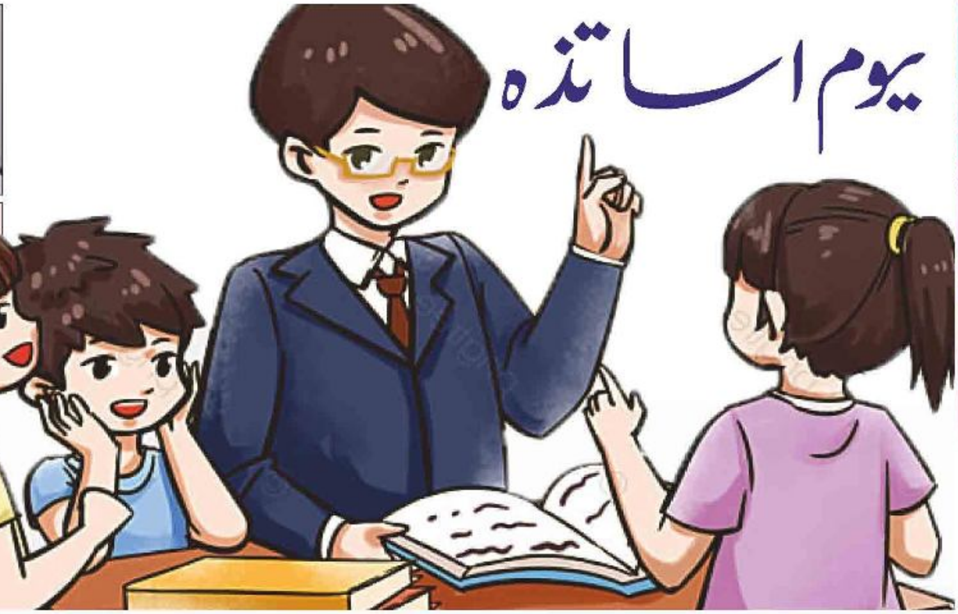

یوم اساتذہ

"کتنی محبتوں سے پہلا سبق پڑھایا
میں کچھ نہ جانتی تھی سب کچھ مجھے سکھایا
پہنچا دیا فلک تک استاد نے یہاں سے
واقف نہ تھی ذرا بھی اتنے بڑے جہاں سے"

یوم اساتذہ جسے 'ٹیچرس ڈے' بھی کہا جاتا ہے، ڈاکٹر رادھا کرشنن کے یوم پیدائش یعنی 5 ستمبر کو ہر سال نہایت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی پیدائش تھروٹنی کے قریب کے دیہات میں ہوئی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نہ صرف ایک عظیم سیاست داں اور فلسفی تھے بلکہ 1952 سے 1962 تک آزاد ہندوستان کے پہلے نائب صدر جمہوریہ اور 13 مئی 1962 سے 13 مئی 1967 تک آزاد ہندوستان کے دوسرے صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز رہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن بیسویں صدی کے ایک ممتاز ہندوستانی مفکر تھے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اور تدریسی میدان کے ماہرین میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کو ادب کے لیے کئی مرتبہ 'نوبل پرائز' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ انھیں 1954 میں ہندوستان کے سب سے بڑے اعزاز 'بھارت رتن' سے سرفراز کیا گیا۔ ان کی علمی صلاحیتوں کے اعتراف میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے بھی نوازا گیا۔ الغرض ڈاکٹر رادھا ایک عظیم شخص تھے، جب ڈاکٹر رادھا کرشنن کے دوستوں نے ان کی سالگرہ منانا چاہی تو ڈاکٹر رادھا کرشنن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی یوم پیدائش کو ٹیچرس ڈے کے نام سے منسوب کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا 1962 سے حکومت ہند نے 5 ستمبر کو یوم اساتذہ کے طور پر منانے کا اعلان کیا تب سے ہندوستان کے طلبا اپنے اساتذہ کے اعزاز میں اس دن کو مناتے ہیں۔

یوم اساتذہ کے دن بچوں میں کافی جوش وخروش پایا جاتا ہے کیونکہ یہ دن ان کے سب سے مشفق اور عظیم ہستی کے نام سے منسوب ہوتا ہے، اس دن سب سے بڑی جماعت کے طلبا وطالبات تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں، طلبا اساتذہ کی عظمت بیان کرنے کے لیے ثقافتی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ یوم اساتذہ کے دن بچوں کو استاد کی عظمت کا احساس دلایا جاتا ہے کہ کس طرح ایک استاد مختلف مسائل کا سامنا کرتے ہوئے

اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس دن بچے اپنے محنتی اور مخلص اساتذہ کی کاوشوں کی تعریف کرتے ہیں، ان کے کردار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنے اسکول اور کالجوں میں مختلف سرگرمیوں کا انعقاد کرتے ہیں، جن میں تقاریر، ڈرامے، شاعری، نظمیں اور خاکے وغیرہ کے ذریعے اساتذہ کی عظمت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

یوں تو ہر معلم مثالی ہوتا ہے لیکن اگر کوئی معلم بچوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوئی کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے تو اس دن ریاستی اور فلسفی سطح پر اور اسی طرح دیگر اداروں کی جانب سے اسے مثالی معلم ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے اور اس کی کاوشوں اور محنتوں کو سراہا جاتا ہے۔

”اے استاد تیری عظمت کو سلام
تیری محبت بھری شفقت کو سلام
تو ہے تو ہے قوم میں تعلیم کا زور
تیری کی ہوئی ہر جدوجہد کو سلام“

یوم اساتذہ کے دن اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے کیونکہ اساتذہ کسی بھی معاشرے کے معمار ہوتے ہیں۔ قومیں نئی نسلوں میں اپنی اقدار اور روایات جن اقدار کے ذریعے تشکیل کرتی ہیں ان میں اساتذہ کا نام سرفہرست ہے۔ جو نئی نسلوں کو حرف شناسی سے لے کر قومی و ملی امنگوں سے ہم آہنگ کرواتے ہیں اور تہذیب و تمدن کو پروان چڑھاتے ہیں۔ دنیا کی ہر کامیاب اور بلند ہستی نے استاد گرامی کی ہدایت اور رہنمائی میں اپنا نام تاریخ کے اوراق میں روشن کیا۔ اسلام میں استاد کا رتبہ والدین کے رتبے کے برابر ہے۔ والدین بچوں کو آسمان سے زمین پر لاتے ہیں مگر استاد بچوں کی تعلیم و تربیت کر کے انھیں مزین کر کے آسمان کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ استاد وہ شخصیت ہے جس کی عظمت کی گواہی خود خاتم الانبیا آپؐ نے دیتے ہوئے اپنے آپ کو معلم بتایا۔ آپؐ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ”بیشک مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا۔“

معاشرے میں استاد کو روحانی والدین کا درجہ حاصل ہے۔ اسلام میں استاد کا رتبہ والدین کے رتبے کے برابر قرار دیا گیا ہے کیونکہ دنیا میں والدین کے بعد اگر کسی پر بچے کی تربیت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے تو وہ معلم یعنی استاد ہے

معاشرے میں استاد کو روحانی والدین کا درجہ حاصل ہے۔ اسلام میں استاد کا رتبہ والدین کے رتبے کے برابر قرار دیا گیا ہے کیونکہ دنیا میں والدین کے بعد اگر کسی پر بچے کی تربیت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے تو وہ معلم یعنی استاد ہے کیونکہ استاد ہی ہے جو ہمیں دنیا میں جینا اور رہنا سہنا سکھاتا ہے اور کتابوں کا علم سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ بچپن کے دنوں میں ہاتھ پکڑ کر قلم چلانے کا انداز بتانے کا ذکر ہو یا لڑکپن میں وائٹ بورڈ پر ریاضی کے فارمولے سکھانے کا ہنر ہو یا کالج کے ایام میں، اچھی زندگی گزارنے کی نعمتیں ہوں یا یونیورسٹی کے دنوں میں تخلیقی کاوشوں کی مشق کرنے کا گر ہو ہر منزل اور مقام پر اساتذہ کی رہنمائی شاگردوں کے لیے مشعل راہ بنتی ہے۔ اساتذہ ہی ہیں جن کی بدولت کوئی افلاطون بنا تو کوئی سقراط، کوئی سکندر اعظم بنا تو کوئی ارسطو، کوئی نیوٹن بنا تو کوئی آئنسٹائن، چنانچہ اس لحاظ

سے استاد واجب الاحترام شخصیت ہے۔

"کام یوں تو سہل آتا ہے نظر ہر اک مگر
عزم پیہم چاہیے مقصود کی تحصیل میں
فن جسے کہتے ہیں لمحوں کا عمل ہرگز نہیں
عمر کٹ جاتی ہے اک شہکار کی تشکیل میں"

گویا اگر استاد، معلم یا مدرس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک استاد لوہے کو تپا کر کندن بناتا ہے، پتھر کو تراش کر ہیرا بناتا ہے، بنجر زمین کو سینچ کر ہرا بھرا بناتا ہے، دنیا میں بہت کم لوگ دوسروں کو خود سے آگے نکلتا دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں ان میں سرفہرست ہمارے والدین ہوتے ہیں اور دوسرے ہمارے اساتذہ جو چاہتے ہیں کہ ان کے طالب علم ان سے بھی زیادہ کامیاب ہوں۔ وہ لوگ طلبا کی کامیابی کو ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں اس لیے استاد واجب الاحترام اور لائق تعظیم ہے۔

استاد ہی وہ مخلص شخصیت ہوتی ہے جو اپنے طالب علموں کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے، طالب علموں کو اعتماد کی طاقت دینے کی بات ہو یا شخصیت کو پرکشش بنانے کا مقام آئے یا نصابی و غیر نصابی تقریبات میں بچوں کی تیاری کا عمل ہو غرض درسگاہ سے وابستہ ہر نصابی و غیر نصابی سرگرمی استاد کی شخصیت کے بنا ادھوری ہے۔ جب سے یہ دنیا بنی ہر دور میں علم و فن کی مہارت کے لیے استاد سے رہنمائی حاصل کی گئی۔ چاہے وہ بچپن میں قرآن سیکھنے کا عمل ہو، استاد کی رہنمائی میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے کا عمل ہو، ثانوی تعلیم کا حصول ہو، یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد استاد کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہے۔ استاد ہی ایک اچھا اور مہذب انسان بناتا ہے، جبھی تو کہا جاتا ہے کہ۔

"گمنامی کے اندھیرے میں تھا ایک پہچان بنا دیا
دنیا کے غم سے انھوں نے مجھے انجان بنا دیا
ان کی مجھ پر یہ کیسی مہربانی ہوئی
کہ میرے استاد نے مجھے ایک اچھا انسان بنا دیا"

اساتذہ کی خدمت عظیم اور اعلیٰ و رفع ہے اس لیے ہر دن ٹیچرس ڈے ہونا چاہیے۔ہاں یہ ضروری ہے کہ اس طرح استاد محترم کی یاد اور بے مثل ہستی کے فیض سے جاری چشموں کا ذکر کر کے ہم بھی چند بوندوں سے خود کو سیراب کر لیتے ہیں۔اس دنیا میں استاد محترم کا ادب کرنے والے درحقیقت دنیا و آخرت کا خزانہ سمیٹتے ہیں کیونکہ استاد ہی وہ شخص ہے جو ہمیں اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے سے لے کر ایک مہذب معاشرے میں رہنے اور جینے کے تمام طریقے سکھاتا ہے، اور ہمیں لائق و فائق انسان بناتا ہے۔ کہتے ہیں نا استاد بادشاہ نہیں ہوتا مگر اپنی محنت و لگن اور جانفشانی سے اپنے طالب علموں کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔استاد ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ تھکے بغیر، رکے بغیر، ناامید ہوئے بغیر، تنقید کی پرواہ کیے بغیر، ہر موسم اور ہر حالت میں اپنے چہرے مہرے پر مسکان سجائے اور دل میں محبت کا دیپ جلائے لب پر دعا کے پھول کھلائے، حوصلے اور جرأت کے ساتھ مسلسل اپنے طالب علموں کی ترقی کے لیے کوشاں رہنے والی شخصیت کا نام ہے۔ اس لیے تو کہتے ہیں۔

"دست معصوم کو وہ لوح قلم دیتا ہے
نونہالوں کو وہ قندیل حرم دیتا ہے
روشنی بانٹتا پھرتا ہے وہ سورج کی طرح
ڈوبتا ہے تو ستاروں کو جنم دیتا ہے"

انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہر طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی مانگ ہے۔ ہر انسان دن بھر انٹرنیٹ موبائل اور کمپیوٹر کے گیت گا رہا ہے۔لوگوں اور خاص طور سے بچوں کی اخلاقی قدریں پست ہو رہی ہیں، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آج سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کے کردار کی تعمیر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہ جائے۔اس لیے آج کے معاشرے میں قابل، باصلاحیت، محنتی اور مخلص اساتذہ کی بے حد ضرورت ہے۔ حالانکہ آج بچوں میں استاد کا احترام، اقدار اور قدر و منزلت پہلے جیسی نہیں مگر آج اگر ہر استاد نے معاشرے کی ذمہ داری قبول نہیں کی تو یہ قوم گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جائے گی۔

"یہ غم کھاتا چلا جاتا ہے مجھ کو
مجھے اس خوف سے فرصت نہیں ہے
کہیں برکت نہ اٹھ جائے وہاں سے
میاں استاد کی عزت نہیں ہے"

آج بھلے ہی طالب علموں میں اخلاقی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں، معاشرہ تنزلی کی طرف گامزن ہے۔ اس پر آشوب دور میں بحیثیت ایک استاد ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ ہمارے طالب علم ہماری حقیقی اولاد ہیں اور انھیں گمراہی اور گمنامی کے دلدل سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ ہم اساتذہ ہی ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت دے سکتے ہیں اور انھیں کامیاب اور کامران کر سکتے ہیں۔ ہمیں آج یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہماری محنت، کاوشوں، جانفشانی اور خلوص سے معاشرہ ایک بار پھر تہذیب و تمدن کی ڈگر پر واپس آئے گا اور ملک میں انقلاب برپا ہوگا۔ واقعی کسی نے شاید اساتذہ کی کاوشوں کو سراہنے کے لیے یہ اشعار کہے ہیں۔

"جلال آتش برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو خود ہی انقلاب پیدا کر"

■

Dr. Ansari Sharmeen Md. Tarique
518, Panjrapole, 4th Nizampur
Bhiwandi - 244430 (MS)
Mob.: 9323524281

''میں نے اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھا ہے''

نذیر فتح پوری

س: بچپن کی کون سی باتیں، شوخیاں، شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: بچپن نے شوخیاں اور شرارتیں کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ بس ایک بات یاد رہ گئی۔ تتلی مجھے بچپن میں بھی پسند تھی آج بھی پسند ہے۔ میری شاعری میں جگہ جگہ تتلیوں کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ بچپن میں تتلی کے پیچھے دوڑ کر تتلی پکڑنے میں بڑا لطف آتا تھا، ایک بار ایک تتلی پکڑ کر مٹھی میں بند کر لی تو وہ مر گئی۔ اس کے بعد کبھی تتلی نہیں پکڑی، لیکن تتلی آج میرے لیے کشش کا باعث ہے۔

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟

ج: بچپن میں ایک نظم 'ایماندار لڑکا' پسند تھی۔ یہ نظم آج بھی یاد ہے۔ 'لب پہ آتی ہے دعا' یہ نظم بھی بچپن میں پڑھتے تھے، اکبر میرٹھی کی نظم 'حکم کر آب باراں کو' اکثر گرمی کے دنوں میں تمام بچے مل کر پڑھتے تھے۔ ایک نور نامہ اور جنگ نامہ محمد حنیف بھی بچپن میں پڑھا کرتا تھا۔ ایک اور دعا تھی جو صبح کے وقت بستر میں بیٹھے بیٹھے پڑھا کرتا تھا۔ اس کا ایک مصرع آج بھی یاد ہے 'میری بار کیوں دیر اتنی کری' بعد میں یہ نظم تلاش کی مگر نہیں ملی۔

نذیر فتح پوری

س: بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ج: اب کچھ یاد نہیں۔

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟

ج: مجھے یاد ہے ہمارے اسکول میں دلّی سے ماہنامہ 'کھلونا' آتا تھا۔ اس میں ایک کہانی تھی 'نسطورا اور مولوی صاحب' اس نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا، کھلونا میں کرشن چندر کی کہانی 'ایک گدھے کی سرگزشت' بھی میں نے پڑھی تھی۔ جب میں لکھنے لگا تو میں نے اسی گدھے کو بنیاد بنا کر ایک کہانی لکھی تھی 'گدھے کی واپسی' بہت دلچسپ کہانی تھی۔ پورا ناول لکھنے کا منصوبہ بنا لیا تھا، لیکن اچانک وہ صفحات

غائب ہوگئے، پھر وہ کام رک گیا۔

س: بچوں کی ذہنی وفکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: صرف وہاٹس ایپ، اب کوئی بچہ کتاب نہیں پڑھتا۔ میرے گھر کے بچے ماہنامہ 'گل بوٹے' پڑھ لیا کرتے تھے لیکن اب اس سے بھی محروم ہیں۔

س: زبان وبیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟

ج: یہ کام کتابیں پڑھنے سے نہیں ہوگا، اساتذہ کی توجہ سے ہوگا۔ طلبہ کے لیے استاد کے بغیر کتابیں گونگی ہیں۔

س: اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: تعلیمی کوائف تو یہ ہیں کہ درجہ سوم میں داخل ہوا اور درجۂ پنجم میں تعلیم سے فارغ ہوگیا۔ یعنی صرف تین سال درسی کتابوں کی صورت دیکھی۔ کوائف میں یہ بھی شامل کرلیں درجہ چہارم، ششم اور دہم کے اردو نصاب برائے راجستھان میں میری نظمیں شامل رہیں۔ دو یونیورسٹیوں میں میرے فکروفن پر تحقیقی مقالے لکھ کر لوگ ڈاکٹر بن گئے۔ ایک ایم فل کا مقالہ بھی لکھا گیا۔ اب مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں 'نذیر فتح پوری اور ادب اطفال' عنوان سے مقالہ قلم بند کرنے کی اجازت مل گئی اور بہت کچھ بھی۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: 1980 کے آس پاس میری بڑی بیٹی زینت کی خواہش پر ایک گیت لکھا تھا، جس کا عنوان تھا 'بچو! آؤ گیت سنائیں' بعد میں اسی عنوان سے 1983 میں ایک مختصر سی کتاب بھی شائع ہوئی، 1987 میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ میری شاعری کی پہلی کتاب تھی۔ آج میری شاعری کے 20 سے زائد مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان میں اوّلیت بچو! آؤ گیت سنائیں کو ہی ہے۔

بچوں کے لیے نذیر فتح پوری کی کتابیں

س: آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی۔

ج: تاریخ اور ماہ وسال تو یاد نہیں، لیکن کتاب چھپنے سے پہلے 'بچو! آؤ گیت سنائیں' روزنامہ اردو 'انقلاب' ممبئ میں شائع ہوئی تھی۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: وہی جو عام طور پر بچوں کی دلچسپی کے لیے ہوتے ہیں، تعلیم کی اہمیت، ماں باپ کی فرمانبرداری، استاد کا احترام، وطن سے محبت، ہندو مسلم اتحاد، بچوں کے لیے اپنی کہانیوں کی کتاب، چھوٹا بچہ چھوٹی کتاب، جس نے بچوں کے بستوں سے کتابوں کا بوجھ کم کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: کچھ کچھ۔ ورنہ آج عمر کے اس پڑاؤ میں بھی میں نے اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھا ہے۔ اسی سے روشنی حاصل کرتا ہوں

اور ادب اطفال کے لیے لکھتا چلا جا تا ہوں۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: کوئی دقت نہیں، جب چاہتا ہوں بچوں کے لیے لکھ لیتا ہوں، جب چاہتا ہوں نظم نگاری کر لیتا ہوں اور یہ سب کچھ آسانی سے ہو جاتا ہے۔

س: ادب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: بے حد ہوتی ہے۔ میری کہانیوں کی کتاب 'میرا دیش مہان' پر ساہتیہ اکادمی کا قومی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اسی کتاب پر مہاراشٹر اردو اکادمی اور یوپی اردو اکادمی کی جانب سے انعام مل چکے ہیں۔ ڈاکٹر حسن آرا (کوٹہ راجستھان) نے 'نذیر فتح پوری اور ادب اطفال' عنوان سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی ہے جس میں ادب اطفال پر تحریر کردہ میری کتابوں پر مضامین اور تبصرے شامل ہیں۔

س: کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: کبھی کبھی۔ کسی کتاب پر لکھنا ہوتا ہے تو اسے پڑھ لیتا ہوں۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

ج: دیگر زبانوں کے رسائل کا مجھے تجربہ نہیں ہے۔

س: کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: میں صرف اردو رسائل سے واقف ہوں۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: سب اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنا کام کر رہے ہیں۔ کمی و بیشی ہو سکتی ہے، مجھے اردو محبوب ہے۔ اسی لیے اردو رسائل بھی محبوب ہیں اور جو محبوب ہو اس کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: مطمئن نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: میرا خیال ہے بہت کم بچے ادبی رسائل پڑھتے ہوں گے کیونکہ بچے اب اردو اسکول کا راستہ بھول چکے ہیں۔ انگریزی کا سکہ چل رہا ہے اس لیے موضوعات کا اندازہ ہی نہیں لگتا۔ میں تو اپنی پسند کے موضوعات پر لکھتا ہوں۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے؟

ج: اس سوال کا صحت مند جواب تو وہی حضرات دے سکتے ہیں جو تعلیمی شعبوں میں کام کرتے ہیں۔

س: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: کم عرصے میں 'بچوں کی دنیا' میں کافی صحت مند تبدیلیاں ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ آپ جیسے فعال ذہن کے لوگوں نے اس کی ذمے داری سنبھال رکھی ہے۔ ہاں! ایک تبدیلی تو نہیں اضافہ چاہتا ہوں۔ ایسی تحریک چلائی جائے کہ بچوں کی موبائل بینی پر قدغن لگ جائے، لیکن یہ کام جوئے شیر کی فراہمی سے بھی دشوار تر ہے۔ پھر کوشش تو کی جا سکتی ہے۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ج: یہی کہ بچے موبائل اور وہاٹس ایپ سے دور رہیں اور درسی کتابوں کے ساتھ ہی ادب اطفال سے متعلق کتابیں پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔

■

Nazeer Fatehpuri
Saira Manzil, 203/B/102
Viman Darshan, Sanja Park
Lohgaon Road‹Pune - 411032 (MS)

نظم

مزدور ماں کی لوری

راشد جمال فاروقی

میرے سپنوں کی پھلواری
سو جا! میری جان سے پیاری
ماں تیری مجبور ہے بیٹی
معمولی مزدور ہے بیٹی
دیکھ! تھکن سے چور ہے بیٹی
ہر راحت سے دور ہے بیٹی
روکھا پھیکا کھانا ہوگا
کل پھر کام پہ جانا ہوگا
کام کریں گے تو کھائیں گے
ورنہ بھوکے مر جائیں گے
دن بھر تو بھی گود کو ترسے
سر پر دھوپ کے شعلے برسے
اتنی چلّا کر روتی ہو!
ناحق اپنی جاں کھوتی ہو
مجھ کو کیا معلوم نہیں ہے؟
کیا اماں مغموم نہیں ہے
ابا جب سے ترے سِدھارے
ہم ہیں ظالم جگ سے ہارے
کپڑے جوتے کھیل کھلونے
راجا رانی پریاں بونے

یہ سب تیرا ہے نہ میرا
یہ دنیا اک رین بسیرا
چھوڑ کے سب کچھ جانا ہوگا
ساتھ نہ کچھ لے جانا ہوگا
صبر غریبوں کی دولت ہے
حرص و ہوس تو اک وحشت ہے
ہم کیوں دہشت وحشت پالیں
جو مل جائے پی لیں کھا لیں
شکر خدا کا ادا کریں گے
نہ شکوہ، گلہ کریں گے
صابر ہوں، غیور ہوں میں بھی
دیکھ تھکن سے چور ہوں میں بھی
حد درجہ مجبور ہوں میں بھی
سو جا میری جان سے پیاری
میری سپنوں کی پھلواری

(تعارف جنوری 2022 میں شائع ہوچکا ھے)

■

Rashid Jamal Farooqui
C-6, Thokar No 8, Shahin Bagh
New Delhi - 110025
Cell.: 9456753096

نظم

ای۔علم

ابواللیث جاوید

تمنا تھی پڑھوں کالج میں جاکر
کروں فیشن، اٹھاؤں اپنے کالر
بناؤں دوست ہر اچھے بھلے کو
پڑھاکو کو، کھلاڑی، مسخرے کو
ہوا جب داخلہ کالج میں آن لائن
بدل گئی میری قسمت کی ہی لائن
سنا جب کلاس بھی آن لائن ہوں گے
نہ سننے پر کوئی نہ فائن ہوں گے
بنے گا اپنا کمرہ تعلیمی مرکز
نہ ہوگا دوسرا موجود ہرگز
ملے استاد کے صوتی خد و خال
نظر کچھ بھی نہ آئے گا بہرحال
اہم ہوگی بس اپنی ہی سماعت
ملے گی ہم کو ہوائی قیادت
ہوا آغاز جب پہلے سبق کا
سمجھ میں کچھ نہ آیا خدایا
بہت ہلکان میرا جی ہوا تھا
بہت حیران قسمت پر ہوا تھا
نہ کالج، نہ کوئی استاد و ساتھی
یہ ویرانی نہ میرے دل کو بھائی
جراحی [1] کس طرح آن لائن ہوگی
معماری [2] کس طرح آن لائن ہوگی
خدایا کیا یہ ہوتا جارہا ہے
ہمارا علم کھوتا جارہا ہے
یہ سارا علم ہی معدوم ہوگا
زمانہ کو یہ کب معلوم ہوگا؟
ہمارے سپنے سارے چور ہوئے
ترقی سے ہم کوسوں دور ہوئے
دعا کرتا ہوں یارو اپنے رب سے
کرو تائید میری التجا سب سے
خدا آن لائن سے مجھ کو بچانا
جو رستہ ٹھیک ہو اس پر چلانا
چلے ماں باپ جس رستے پر میرے
چلیں پاؤں بھی اس رستے پہ میرے

نہیں منظور مجھ کو ای۔علم ہونا
مجھے تو ہے خدا ذی۔علم ہونا

■

Abul Lais Javed
H-17/11, Ali Aptt., Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Mob.: 9873070412

[1] سرجری [2] سول انجینئرنگ

احتیاط

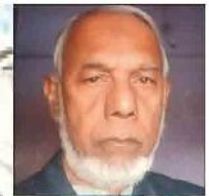

محمد رفیع انصاری

ایک دن کہنے لگی ہنس کر نشاط
بولیے تو کیا ہے دادا 'احتیاط!'
سٹپٹا کر رہ گئے سن کر سوال
کچھ عجب سا ہوگیا دادا کا حال
جب ٹھکانے پر ہوئے ان کے حواس
تب گِنانے لگ گئے اس کے خواص
مت رہو ہر آن اپنے میں مگن
کام آتا ہے یہاں چوکنا پن
بے خبر گھاٹے میں ہے یاں سربسر
کامیاب و کامراں ہے باخبر
آدمی کیا اور کیا اس کی بساط
روگ سے بہتر مگر ہے احتیاط
کام یہ مشکل نہیں آسان ہے
جو نہ سمجھے وہ بڑا نادان ہے
جتنا ممکن ہے یہاں بچتے رہو
اور پھر آرام سے جیتے رہو
یہ گرہ میں باندھ لے ہر نوجواں
جان ہے باقی تو باقی ہے جہاں

(تعارف اپریل 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Mohd Rafi Ansari
'Al-Madni' 734, Bhar Mohalla
Bhiwandi - 421308
Distt.: Thane (MS)

نظم

پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے

رفیق گلاب

مجھ کو پڑھنا لکھنا ہے
پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے
میں نے دیکھا ہے جو خواب
خواب وہ پورا کرنا ہے

مجھ کو پولس بننا ہے
مجھے مصور بننا ہے
مجھ کو لیڈر بننا ہے
مجھ کو منصف بننا ہے

مجھ کو ڈاکٹر بننا ہے
انجینئر بننا ہے
مجھ کو ٹیچر بننا ہے
مجھے کھلاڑی بننا ہے

مجھ کو پڑھنا لکھنا ہے
پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے
میں نے دیکھا ہے جو خواب
خواب وہ پورا کرنا ہے

مجھ کو پڑھنا لکھنا ہے
پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے
میں نے دیکھا ہے جو خواب
خواب وہ پورا کرنا ہے

مجھ کو انساں بننا ہے
اچھا انساں بننا ہے
مجھ کو انساں بننا ہے
اچھا انساں بننا ہے

(تعارف ستمبر 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)

مجھ کو پائلٹ بننا ہے
مجھے مصنف بننا ہے
مجھ کو فوجی بننا ہے
مجھ کو افسر بننا ہے

مجھ کو پڑھنا لکھنا ہے
پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے
میں نے دیکھا ہے جو خواب
خواب وہ پورا کرنا ہے

■

Rafique Gulab
3-C-102, Sarvodaya Park
Kalyan
Thane- 421301 (MS)
Mob: 9323361261

ارشاد احمد ارشاد

ماہیے

رات جلد سو جانا
اچھی ہے بہت عادت
صبح جلد اٹھ جانا

اک بات کہوں سچی
غیبت سے بچو بچو!
غیبت تو نہیں اچھی

نہ وقت گنوانا تم
اس کل کے تو دھوکے میں
بچوں نہیں آنا تم

تعلیم سکھاتی ہے
جینا ہے ہمیں کیسے
ہم کو یہ بتاتی ہے

دنیا میں جو عزت سے
رہنا ہے اگر تم کو
بچنا یہاں غیبت سے

دنیا کی نگاہوں میں
گرنا نہیں تم چاہے
گرنا کہیں راہوں میں

ماں باپ کا تم کہنا
مانو بڑے دل سے گر
سکھ چین سے ہے رہنا

آنکھیں نہ بدل لینا
ماں باپ کے تم اپنے
دل سے نہ نکل جانا

لہجے میں نہ ہو سختی
ماں باپ سے جب بولو
آواز نہ ہو اونچی

اک بات کہوں سچی
تم پاک ہی رہنا بس
پاکی ہے بہت اچھی

سچ بولنا ہے اچھا
ہے جھوٹ بری عادت
سچ بولے سدا سچا

جھوٹوں سے بھی بچنا تم
جھوٹوں کی ہی صحبت میں
جھوٹے نہ ہو جانا تم

■

Irshad Ahmad Irshad
House No.: 1206
Gali No.: 39/4, Jafrabad
Delhi - 110053
Mob.: 7011543560

نظم

کلیم رہبر

روز اسکول جائیں گے ہم

روز اسکول جائیں گے ہم
دولتِ علم پائیں گے ہم

جو پڑھایا ہے استاد نے
جو سکھایا استاد نے
یاد کرکے بتائیں گے ہم
روز اسکول جائیں گے ہم

جن کو اچھائی سے پیار ہو
جن کو سچائی سے پیار ہو
دوست ایسے بنائیں گے ہم
روز اسکول جائیں گے ہم

اپنی اپنی کتابیں لیے
اپنی اپنی بیاضیں لیے
سب کو پڑھنے بلائیں گے ہم
روز اسکول جائیں گے ہم

شوق سے صبح اور شام میں
اپنے ماں باپ کے کام میں
ہاتھ اپنا بٹائیں گے ہم
روز اسکول جائیں گے ہم

کوئی ساتھی جو بیمار ہو
اور مجبور، لاچار ہو
اس کو سب ملنے جائیں گے ہم
روز اسکول جائیں گے ہم

■

Kaleem Rahbar
Chikhli Road
Amdapur,
Distt.: Buldana - (MS)
Mob.: 9767125832

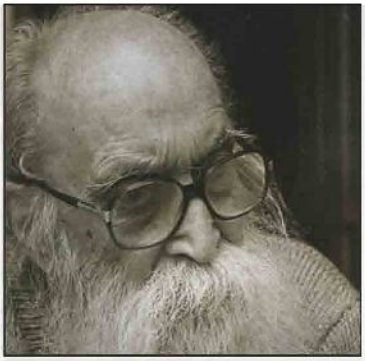

چار لاکھ 'لوک گیت' اکٹھے کرنے والا

دیویندر ستیارتھی

ندیم راعی مرادآبادی

پیارے بچو! یہ جان کر آپ سب کو تعجب ہوگا کہ اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی کے شاعر و ادیب دیویندر ستیارتھی ملک عزیز کی گلی گلی کوچے کوچے گاؤں گاؤں گھوم گھوم کر اپنی 95 سالہ عمر تک تقریباً چار لاکھ 'لوک گیت' اکٹھے کیے، ایسا کارنامہ آج تک نہ کسی نے کیا ہے اور نہ ہی کوئی کر سکے گا۔

بچو! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان مختلف زبانوں کے بولنے والے زمین سے جڑے یہ لوگ ہمارے ملک کی روح ہیں، ہماری پہچان ہیں جو ہمیں فطرت سے ہم آہنگ کرتے ہیں، جن میں مکمل طور پر ہندوستان بستا ہے۔ ستیارتھی کو 'یہ لوک گیت' ہمہ وقت بلاتے ہیں اور یہ بھوکے پیاسے بے سروسامانی میں چھوٹے بڑے خطروں کو عبور کر کے کچی ڈور کے ساتھ کھنچتے چلے جاتے ہیں اور دور دراز کے گاؤں کھیڑوں میں پہنچ کر انھیں سنتے ہیں اور مگن مدھ ہوکر سکون پاتے ہیں جیسے انھیں کوئی امرت مل گیا ہو۔؟

ان گیتوں میں راجے مہاراجے، نوابین، زمین دار و جاگیرداروں کے قصے، ان کے ظلم وستم، کسانوں کی زبوں حالی، دلتوں، مظلوموں کی بے چارگی، خوشی غمی، تیر تہواروں اور شادیوں کے موقع پر ان کی ہی زبان میں ان کے ہی رنج وغم و خوشیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

ستیارتھی جی کو لوک گیتوں میں بچپن سے ہی دلچسپی تھی اور جوانی کی دہلیز پر پہنچتے پہنچتے یہ دلچسپی دیوانگی کی حدوں کو پار کر گئی اور بے سروسامانی و خالی جیب گھر سے نکل پڑے لوک گیت اکٹھا کرنے کے لیے۔ کسی نے کچھ کھانے کو دیا تو کھالیا ورنہ پانی پیکر ہی گزارا کرلیا، اس کارعظیم کے لیے نہ تو کسی سرکاری و نیم سرکاری اداروں نے کوئی مالی تعاون کیا نہ ہی خود کے پاس وسائل تھے، کچھ تھا تو وہ تھا 'لوک گیت' اکٹھے کرنے کا عشق و جنون.....؟

اسی عشق و جنون، مصیبتوں، پریشانیوں اور بھوک و پیاس کی زندگی گزارنے کے بعد انھیں وہ شہرت حاصل ہوئی جو کم ہی قلمکاروں کا نصیب بنتی ہے۔ پدم شری کے اعزاز کے ساتھ آپ کو ہندی ساہتیہ سادھنا سمان سے نوازا گیا اور ملک کی مختلف اردو، ہندی اور پنجابی اکادمیوں کے متعدد ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ نیز اردو زبان وادب و فلم انڈسٹری کے عالمی شہرت یافتہ عظیم شاعر و گیت کار ساحر لدھیانوی نے تمام عمر شاعری کی لیکن دیویندر ستیارتھی سے متاثر ہوکر ان کی حیات و خدمات پر ایک نثری کتاب 'نئے ادب کے معمار دیویندر ستیارتھی' لکھی۔

ایک راجہ کو جب انھوں نے اسی راجیہ کا ایک لوک گیت سنایا تو راجہ نے معلوم کیا کہ یہ گیت انھیں کہاں سے دستیاب ہوا تو ستیارتھی نے بتایا ''جیل میں مقید ایک عورت سے'' راجہ نے اس عورت کو فوراً جیل سے رہا کرنے کا حکم دیا۔

سالہا سال در در بھٹکنے کے بعد جو تجربات و آہنگ انھوں

نے حاصل کیا اسے اپنی تخلیقات میں پرویا، جو مختلف و منفرد ہی نہیں بلکہ ادب کا اعلیٰ نمونہ بن کر منظر عام پر جلوہ افروز ہوئیں جسے خوب سے خوب تر سراہا گیا اور چہار سو پذیرائی ہوئی، جس نے آپ کو دیگر سے ممتاز قلمکار بنا دیا۔

دیویندر ستیارتھی نے خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گزاری، جہاں ٹھہر گئے وہیں گھر ہو گیا، شادی کے بعد کچھ ہی دن بیوی کے ساتھ رہے کہ جو ایک دن بھاگے تو مہینوں بعد گھر لوٹے، دوبارہ رخت سفر باندھا تو بیوی بولی کہ ''میں بھی ساتھ چلوں گی تم راجہ میں رانی، تم بھکاری میں بھکارن'' جواب دیا پہلے والی بات چھوڑو، دوسری ٹھیک ہے، چنانچہ دونوں 'لوک گیتوں' کے بھکاری بن گئے۔

''میں بھی ان کے ساتھ یاترا پر نکل پڑی، کہاں کہاں گئی اب تو کچھ یاد نہیں، لیکن بڑی سنکٹ بھری یاترا تھی، راستے میں یہ مجھے دھرم شالہ میں چھوڑ کر چلے جاتے، کویتا کا جنم جس وقت ہوا اس وقت یہ برما میں تھے۔ 1932 کا زمانہ مجھے اکیلے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا ایک بار تو وہ مجھے اور کویتا کو چھوڑ کر شانتی نکیتن چلے گئے، کئی دن تک واپس نہیں آئے، پیچھے میں پریشان ہوتی رہی، کویتا چھ برس کی تھی، گھبراہٹ کے مارے میرا برا حال تھا، آخر کویتا کو ایک پڑوسی کے یہاں چھوڑ کر میں شانتی نکیتن جا پہنچی واپس آکر دن دن بھر گھر سے باہر راستے میں خوب پریشانیاں آتی تھیں، پیسہ تو رہتا نہیں تھا، اِدھر اُدھر سے انتظام ہو جاتا تھا، میں کھادی پہنتی تھی سو زیادہ کی ضرورت نہیں تھی، میں شکایت نہیں کرتی۔''

کویتا جب بڑی ہو گئی تو میرا گھومنا تھما، لنکا یاترا کے بعد میں لاہور میں رہ کر اسے پڑھانے لگی، لاہور میں پانچ برس گزار کر ہم دلی آگئے، ان کے دوست آئی سی ایس مسٹر رندھاوا نے ایک چھوٹی سی ملازمت دے دی، سو زندگی ٹھیک راستے پر چل نکلی، آزادی کے بعد یہ 'آج کل' کے ایڈیٹر ہو گئے، اب تو بڑے بڑے ادیب ملنے آتے، خوب نام بھی ہو گیا، کویتا نے ہندی میں ایم اے کر لیا پیسے کی دقت نہیں تھی یہاں تک کہ انھوں نے ایک گاڑی خرید ڈالی اور اس کے لیے ایک ڈرائیور بھی رکھ لیا، بعد میں گاڑی بیچنی پڑی اسی پیسے سے زمین خریدی، آٹھ برس 'آج کل' کی ادارت کرنے کے بعد اس سے الگ ہو گئے اور پھر وہی گھومنا پھرنا۔؟

ایک بار پاکستان گئے تو وہاں سے لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، میرے پاس پتہ تک نہیں تھا، کہاں چٹھی لکھوں؟ کیسے چٹھی لکھوں؟ اور ان کے خط لکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، چار مہینے تک انتظار کرتے کرتے میں تو پتھرا گئی، لڑکیاں بھی دکھی تھیں، اس سلسلے میں میں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو ایک خط بھی لکھ ڈالا کہ میرے شوہر کو پاکستان سے واپس بلانے میں میری مدد کرو، انھوں نے پاکستان میں انڈین ہائی کمشنر کو لکھا، ان کے سمجھانے بجھانے پر ستیارتھی جی گھر واپس آئے۔''

یہ بیان ایک خاکہ نگار، افسانہ نویس، ناول نگار، شاعر، پدم شری، عوامی ادب پر کام کرنے والے ایک ایسے اسکالر کی بیوی کا ہے جس کا اردو زبان و ادب میں کوئی میل ملنا مشکل ہے۔ بہر حال اسی دوڑ دھوپ کے نتیجے میں اردو میں چار کتابیں منظر عام پر آگئیں: میں ہوں خانہ بدوش، گائے جا ہندوستان، نئے دیوتا اور بانسری بجتی ہے۔

بچو! ستیارتھی جی ہر حال میں ہمیشہ پد یاترا کرتے رہے 'آج کل' کی ادارت کے آٹھ سال سکھ میں ضرور بتائے لیکن یہ سکھ بھی انھیں 'دیش بھرمن' کرنے سے نہیں روک سکا۔

ستیارتھی جی کے اردو ہندی میں بہت سے افسانے مثلاً چائے کا رنگ، اگنی، اسکینڈل کا پوائنٹ، دوراہا، آٹوگراف بک، لیلا روپ، ان دیوتا، ستلج پھر بپھرا، لاوارث، شب نما، بانسری بجتی

رہی، اگلا پڑاو، تلافی، جھمکے، کمسن گاہ، پل، جشن وغیرہ ہیں۔

دیویندر ستیارتھی کا جنم غیر منقسم ہندوستان کے پنجاب کے 'بھدور' موضع میں 28 مئی 1908 کو ایک ہندو مہاجن پریوار میں ہوا، ستیارتھی نے 1926 میں ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور جلد ہی اپنا تعلیمی سلسلہ ختم کر کے گاؤں گاؤں جا کر 'لوک گیت' جمع کرنا شروع کر دیا، آخر دیویندر ستیارتھی کا سفر تمام ہوا۔ ستر (70) کتابوں کے خالق، چار لاکھ لوک گیتوں کو اکٹھا کرنے والے دیویندر ستیارتھی 12 فروری 2003 کو دہلی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، ان کے اکٹھے کیے گئے لوک گیتوں (جن میں سے بہت سے 1957 دہلی کے سیلاب کی نذر ہو گئے) کو ستیارتھی ہندوستان کی عوام کی ملکیت مانتے۔ نہ ہی انھوں نے کوئی لوک گیت کسی کو فروخت کیا اور نہ ہی پیشکش کی اجرت ہی لی۔ درج ایک گیت یہ ہے۔

لوک گیت

کیسر بنّا باغوں میں آیا رہے
کیسر بنّا باغوں میں آیا رہے
تھوڑی، سج دھج کے آوری
سکھین سب آوری
مالا پہناوری
کیسریا بنّا باغوں میں آیا رے

یہ میرے ہاتھ چوکھی دینا
یہ میرے ہاتھ چوکھی دینا
میں تو جیون بن کر آئی
محلوں میں ایسی چھائی
کیسریا بنّا باغوں میں آیا رہے

یہ میرے ہاتھ پھولوں کی ڈالی
یہ میرے ہاتھ پھولوں کی ڈالی
میں جو مالن بن کے آئی
باغوں میں ایسی چھائی
کیسریا بنّا باغوں میں آیا رہے

یہ میرے ہاتھ پاؤں کے بیٹرے
یہ میرے ہاتھ پاؤں کے بیٹرے
میں جو لالی بھر کہ آئی
رنگوں میں ایسی چھائی
کیسریا بنّا باغوں میں آیا رہے

آوری سج دھج کے آوری
سکھین سب آوری
مالا پہناوری
کیسریا بنّا باغوں میں آیا رے

آپ کے ناولوں میں، رتھ کے پہیے، کٹھ پتلی، دودھ گاچھ، برہم پتر، کتھا کہو، آروشی، تیری قسم اور ستلج ہیں، خودنوشت میں چاند سورج کی ویرن، نیلکھنٹی، سفرنامہ پاکستان، دیگر تخلیقات، چاند سے پوچھ لو، چائے کا رنگ، نئے دھان سے پہلے، سڑک نہیں بندوق، دھرتی گاتی ہے، بیلا پھولے آدھی رات، باجت آوے دھوں، چترون میں لوٹیاں وغیرہ ہیں۔

(کوائف دسمبر 2020 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Nadeem Raee Moradabadi
198, Chaudhry House, Galshaheed,
Muradabad-244001
Mob. 8188937127

اسداللہ

پھر نیا سوال

گھر میں عدنان اکلوتا بچہ تھا اسی لیے سب کا لاڈلا تھا۔ سبھی کو انتظار تھا کہ کب وہ بولنا شروع کرے تو اس کی پیاری پیاری باتیں سنیں۔ عدنان جب کچھ بڑا ہوا تو بولنے لگا اور بس بولتا ہی چلا گیا۔ دن بھر مزے مزے کی باتیں کرتا، سب سنتے اور خوش ہوتے۔ وہ طرح طرح کے سوالات پوچھتا۔ کوئی نیا لفظ اسے یاد رہ جاتا تو اسے بار بار دہراتا اور کبھی کبھی اسے اس طرح استعمال کرتا کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

پہلے پہل اس کی باتیں سب کو اچھی لگیں۔ گھر کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے کر بیٹھ جاتے، اس کی دلچسپ باتیں سنتے اور سر دھنتے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بات بات پر سوال کرنے کی اس کی عادت سے لوگ بیزار ہونے لگے۔ اس کے کچھ سوالات تو بڑے پیارے اور آسان تھے جو وہ ہر نئے آدمی کے بارے میں پوچھتا۔ یہ کون ہیں؟ کب آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کب جائیں گے؟ مگر اس کے آگے کچھ ایسے بھی سوالات ہوا کرتے جن کا جواب یا تو کسی کے پاس نہ تھا یا جواب دینا مناسب نہ تھا مثلاً یہ یہیں کیوں آئے کسی اور کے گھر کیوں نہیں گئے؟

وہ عجیب عجیب باتیں سوچتا اور پوچھتا۔ موٹر کار آگے کی طرف کیوں دوڑتی ہے پیچھے کیوں نہیں؟ ہماری دونوں آنکھیں سر پر آگے کیوں ہیں، پیچھے کیوں نہیں؟ یا ان میں سے ایک پیچھے کیوں نہیں؟ لوگ اس کی باتیں سنتے اور حیران ہو کر اس کے بارے میں سوچتے کہ یا تو یہ بہت ذہین ہے، شریر ہے یا پھر بیوقوف ہے۔

عدنان اپنے دادا دادی کا دلارا تھا، وہ اس کے ہر سوال کا جواب بڑی نرمی اور محبت سے مسکرا کر دیتے، اسے ہر بات سمجھاتے، دیر تک اس کے ساتھ بیٹھ کر مزے مزے کی باتیں کرتے اور اسے دلچسپ کہانیاں سناتے۔ دوسرے لوگ کبھی عدنان کی باتوں سے اکتا جاتے، کبھی اس کا مذاق اڑاتے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔ اس کے ہر سوال کا جواب دینا آسان نہ تھا اسی لیے لوگوں کو جھنجھلاہٹ بھی ہو اکرتی تھی۔

ایک دن اس کے ماموں کچھ پریشان تھے۔ انھیں کسی کام کے سلسلے میں جلدی باہر جانا تھا۔ عین اسی وقت عدنان نے اپنے سوالات داغنے شروع کر دیے۔ انھوں نے کسی طرح 'ہاں ہوں' کہہ کر اپنا پیچھا چھڑانا چاہا مگر یہ میاں کب ماننے والے تھے۔ بس اڑ گئے کہ نہیں پہلے ہماری بات کا جواب دیجیے۔

اس پر ان کے ماموں جان نے انھیں سخت سست کہہ دیا ''بس رہنے دو جی! تم ہر وقت کچھ بھی سوچتے ہو اور بے تکے سوالات پوچھتے رہتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ چل دیے۔ عدنان کا چہرہ اتر گیا۔

اس دن اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا اور خاموش خاموش ہی رہا۔ یہ بات اس کے دادا کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ رات میں جب وہ بستر پر لیٹا تو اسی طرح اداس تھا۔ دادا نے وہاں بیٹھ کر اسے کریدنا شروع کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور رو رو کر سارا قصہ اپنے دادا کو کہہ سنایا۔ آخر میں اس نے کہا، 'اب ہم کسی سے بات نہیں کریں گے اور کسی سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔

'ارے میاں تم نے تو ماموں کی بات دل کو لگالی، ارے بیٹا، وہ پریشان تھے اس لیے ایسا کہہ دیا ہوگا' دادا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

نہیں، ہمیں دوسرے لوگ بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ ہم بہت سوال کرتے ہیں، اب ہم کسی سے کوئی سوال نہیں پوچھیں گے۔''

دادا نے عدنان کو سمجھایا کہ سوال پوچھنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ ہاں بہت زیادہ نہیں پوچھنا چاہیے اور اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کب کون سی بات کی جائے۔ دیکھو دنیا کے بہت سے بڑے لوگ اس مرتبے تک اسی لیے پہنچے کہ وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے جوابات ڈھونڈا کرتے تھے۔ ان کا حل ڈھونڈ نکالنے کے لیے کوشش کرتے تھے۔ چلو! ہم تمھیں ایسے ہی دو بڑے سائنس دانوں کی بات بتائیں۔

نیوٹن ایک مشہور سائنس داں تھا۔ ایک دن وہ سیب کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک پیڑ کی شاخ سے ایک سیب نیچے گرا۔ اسے دیکھ کر نیوٹن کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ سیب نیچے زمین پر کیوں گرا؟ اوپر آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا؟ اس نے بہت سوچا اور اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ایک دن ایسا آیا کہ اس کی محنت رنگ لائی اور اس نے دنیا کو سائنس کی ایک بہت اہم حقیقت سے واقف کروایا۔ اسے نیوٹن کے کششِ ثقل کا قانون کہتے ہیں۔ آج دنیا میں زیادہ تر لوگ نیوٹن کو اس کی اسی دریافت کے سبب جانتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک کارنامہ اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنسداں جیمس واٹ نے انجام دیا۔ بچپن میں اس نے ایک دن چولہے پر چڑھی ہوئی کیتلی کو دیکھا جس میں پانی ابل رہا تھا اور اس کا ڈھکن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ڈھکن تھوڑا اوپر اٹھتا اور بیٹھ جاتا۔ بھاپ کے نکلنے پر آواز پیدا ہوتی۔ واٹ نے اس پر بہت غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسے پتہ چلا کہ بھاپ میں ایک طاقت ہے جو اس

برتن کو ہلا رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے تحقیق کی اور آخر اس کی اس دریافت سے بھاپ سے چلنے والی مشین ایجاد ہوئی۔

عدنان کے دادا نے اسے سمجھایا کہ سوال پوچھنا برا نہیں ہے۔ 'تمھاری اس عادت پر کوئی ٹوکے تو برا نہ مانو۔'

مگر عدنان کو صبح جو ڈانٹ پڑی تھی اس کا اثر اور غصہ اب بھی باقی تھا۔ وہ کہنے لگا۔ 'وہ بڑے لوگ تھے' بڑے لوگوں کو کوئی نہیں ڈانٹتا، ہم بچوں کو جس کا جب جی چاہتا ہے ڈانٹ دیتا ہے، اب ہم نہیں پوچھیں گے کسی سے کوئی سوال، بس!' اور یہ کہہ کر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

اگلے دن صبح عدنان کے دادا آنگن میں کسی کام سے آئے تو دیکھا کہ عدنان آم کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہے اور اوپر شاخوں میں کسی چیز کو دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے بھئی؟ دادا نے پوچھا۔ دادا کو دیکھتے ہی وہ ان کے پاس دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

دادا جان دادا جان! یہ چڑیا پیڑ پر اتنی اوپر اپنا گھونسلا کیوں بناتی ہے، نیچے نہیں بنا سکتی؟

یہ سن کر دادا جان زور سے ہنس پڑے اور وہ حیرانی سے انھیں دیکھتا رہا۔

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہو چکا ھے)

■

Mohd Asadullah
30 .Gulistan Colony, Near Pande
Amrai Lawns
NAGPUR - 440013
Mob : 9579591149

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ..........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746:فون

دستخط

تنویر اختر رومانی

راستہ دکھا دیا

افضل اورنیاز میں ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی۔ شروعات افضل ہی کی طرف سے ہوتی لیکن نیاز خاموشی سے سب کچھ برداشت کرلیتا کیونکہ وہ لاکھ ذہین اور نیک سیرت طالب علم سہی، تھا تو غریب۔ افضل کو نیاز سے عداوت اس لیے تھی کہ وہ امتحان میں ہمیشہ اول آتا اور ہر تقریری وتحریری مقابلے میں بھی بازی مار لے جاتا۔ یہ بات افضل کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتی کیونکہ افضل ہمیشہ مقابلے میں دوسرے نمبر پر ہوتا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر نیاز نہ ہوتا تو وہی اول آیا کرتا۔

افضل کسی نہ کسی بہانے سے اسے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس کی غریبی کا مذاق اڑاتا، کبھی جھوٹا الزام لگا کر ٹیچر سے ڈانٹ یا مار کھلوا دیتا۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ اسکول کے سالانہ جلسے میں تقریری مقابلہ تھا۔ سبھی کو پوری امید تھی کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نیاز ہی اول آئے گا۔ مگر نیاز مقابلے میں شامل ہی نہ ہوسکا کیونکہ دو دن قبل ہی افضل نے نیاز کو جان بوجھ کر سائیکل سے دھکّا مار دیا تھا، جس سے نیاز کے سر اور ہاتھ میں گہری چوٹیں آئی تھیں۔

افضل کی ان شرارتوں اور دشمنی کے باوجود نیاز کبھی جوابی حملہ نہ کرتا، بلکہ ہمیشہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا، اس سے اپنائیت اور میٹھے لہجے میں بات کرتا، پڑھائی میں اس کی ہر طرح سے مدد بھی کرتا رہتا۔ پھر بھی افضل کا دل نہ پسیجتا۔

ایک دن افضل اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسکول جا رہا تھا۔ راستے میں نیاز سے ملاقات ہوگئی۔ افضل نے نیاز کا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ ”کیوں بے، کل تم نے ٹیچر کو میرا نام کیوں بتایا تھا؟“

”دیکھو افضل، تم نے ہی بورڈ پر امین سر کا کارٹون بنایا تھا.... سر نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سچ سچ بتا دیا.... اس میں میرا کیا قصور؟“ نیاز نے گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”قصور کے بچّے.... تمھاری ساری سچائی ابھی نکال دیتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر افضل نے نیاز کے گال پر ایک گھونسہ رسید کردیا۔ پھر کیا تھا، افضل کے دونوں ساتھی بھی پل پڑے اور بیچارہ نیاز خاموشی سے پٹتا رہا۔

"ابے، ارشاد سر آ رہے ہیں۔" افضل کے ایک ساتھی نے چلّا کر کہا۔ افضل نے سر اٹھا کر دیکھا تو دؤر سائنس کے ٹیچر، ارشاد سر آ رہے تھے۔ تینوں ساتھی فوراً اپنی اپنی کتابیں سنبھال کر پاس والی گلی میں گھس گئے۔ نیاز خاموشی سے اٹھا اور ہونٹوں سے بہتے خون کو رومال سے صاف کیا اور دوسرے راستے سے گھر کی جانب لوٹ گیا۔ کیونکہ اس حالت میں اس نے اسکول جانا مناسب نہیں سمجھا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن کی بات ہے۔ اسکول جاتے وقت نیاز نے دیکھا کہ افضل کو اس چاٹ والے نے (جس کی دکان سے اسکول کے سارے لڑکے چاٹ کھایا کرتے تھے) گریبان سے پکڑ رکھا ہے۔ نیاز بھی چاٹ کی دکان پر پہنچ گیا اور چاٹ والے سے پوچھا۔ "کیا ہوا رام دھن چاچا؟..... اسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

"تم سے مطلب؟" افضل نیاز پر بگڑ اٹھا۔

"کیوں نہیں ہے مطلب۔" چاٹ والے نے گریبان پر دباؤ ڈال کر کہا۔ "ابھی تو میں اسکول کے سبھی لڑکوں کو بتلاؤں گا... اور تمھارے سارے ٹیچر کو بھی بتاؤں گا.... سب کے سامنے تمھیں ذلیل کروں گا.... آج تمھاری ساری اکڑ خوں نکال دوں گا۔"

"آخر بات کیا ہے؟" نیاز نے پوچھا۔

"ارے بابو نیاز..... یہ کمینہ میرے یہاں سے ہمیشہ ادھار چاٹ کھاتا رہا ہے..... سو روپئے ہوگئے ہیں..... ہمیشہ ٹالتا رہتا ہے.... آج میں نے دینے کے لیے کہا تو اکڑ کر کہنے لگا، نہیں دوں گا، کیا کرلوگے؟..... آج میں اسے بتاؤں گا کہ کیا کرلوں گا۔"

"سنیے رام دھن چاچا!..... یہ اچھی بات نہیں ..... سو روپئے کے واسطے کسی کو بے عزت کرنا ٹھیک نہیں ہے...."

"نہیں تو یہ اور شیر ہو جائے گا۔"

"اچھا سو روپئے مجھ سے لے لینا۔"

"نہیں، میں تو اسی سے وصول کروں گا۔"

"آپ کو اپنے پیسے سے مطلب.... چاہے میں دوں یا وہ دے۔" نیاز نے اپنی جیب سے فیس کے پیسوں میں سے سو روپے نکال کر دے دیے۔ روپے لے کر رام دھن نے افضل کا گریبان چھوڑ دیا۔ اور دونوں خاموشی سے دکان سے چل پڑے۔

افضل، نیاز کے احسان کے بوجھ اور اپنی کرتوت کو یاد کر کے شرمسار ہو رہا تھا۔ کچھ دؤر جا کر افضل نے نیاز سے پوچھا۔ "تم نے اپنی فیس کے روپے کیوں دے دیے؟.... فیس ادا نہ ہوئی تو نام کٹ جائے گا۔"

نیاز نے افضل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میرے دوست، مجھے اپنا نام کٹ جانے سے زیادہ تمھاری عزت کی فکر تھی.... انسان اگر انسان کے برے وقت میں کام نہ آئے تو وہ انسان کیا.... داخلہ تو پھر ہو جائے گا، مگر چار لوگوں کے سامنے تمھاری عزت چلی جاتی تو پھر کبھی نہ آتی۔"

"معاف کرنا نیاز... میں نے تمھارے ساتھ برے سلوک کیے ہیں.... میں اب تک اندھیرے میں تھا... تم نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔"

کہتے کہتے افضل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسکول کی جانب روانہ ہوگئے۔

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)

■

Tanweer Akhtar Roomani
59, C. S. Colony, P.O.: Maango
Jamshedpur-831012(Jharkhand)
Contact No.: 7004384853

کہانی

محمد الیاس

سراب

وہ اپنی تیز رفتار بائک پر سوار ہو کر اپنے ملک کے سب سے مشہور پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف ہاتھ میں ترنگا لیے رواں دواں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ پہاڑ کے نچلے حصے پر پہنچ گیا جہاں سے دوڑ کر اور پیدل چل کر اسے پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنا تھا۔ اس نے پہاڑ کے نشیبی حصے پر کھڑے ہو کر اندازہ لگایا کہ اس پہاڑ پر چڑھ کر چوٹی پر ترنگا لہرانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ لوگ اور ہوتے ہوں گے جو پہاڑ کی بلندی سے ڈر جاتے ہوں گے میں تو ابھی چند لمحوں میں اس کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر جاؤں گا اور اپنے ملک کا پرچم بھی لہرا کر دکھا دوں گا۔ میں کوئی کم ہمت لڑکا نہیں ہوں اس طرح کے تو بہت سے معرکے میں پہلے ہی سر کر چکا ہوں۔ اس کی بلندی میرے حوصلوں کی بلندی کے آگے کچھ بھی نہیں، پھر اس نے پہاڑ کی بلندی پر قدم بڑھانا شروع کیا، درمیان میں کئی طرح کی رکاوٹیں بھی آئیں لیکن کوئی رکاوٹ اس کے سفر کو روک نہیں سکی۔ وہ یوں ہی آگے بڑھتا رہا، بڑھتا رہا اور جب وہ سب سے اونچی چوٹی پر پہنچنے والا تھا اس وقت تو اس کے کئی دشمن اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ اب اس کے سامنے بیک وقت کئی چیلنج تھے وہ اپنے دشمنوں سے بھی لڑ رہا تھا اور اپنا سفر بھی بلندی کی طرف جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں ایسی طاقت محسوس کر رہا تھا جس کے آگے اس کے دشمنوں کی طاقت ہیچ تھی۔ وہ اپنے دشمن پر وار کرتا تو اس کے دشمن لڑھکتے ہوئے بہت نیچے چلے جاتے مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال

لیتے اور پھر اس کا راستہ روکنے کے لیے اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ نہ صرف کھڑے ہو جاتے بلکہ اس کو نیچے گرانے کی کوشش بھی کرتے۔ مگر اس کے حاسد دشمنوں کی ایک بھی چال کارگر نہ ہوئی اور آخر کار وہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ گیا، پہلے اس نے وہاں پہنچ کر مضبوطی سے قدم جمائے اور آخر کار چوٹی پر اپنے ملک کا پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گیا ،اس کے دشمن سب کے سب اس کی کامیابی پر اس کا منہ تکتے رہ گئے۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور اچھلنے کے بعد جو نیچے گرا تو اس کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا، دوسری طرف ڈر یہ بھی تھا کہ اس کی امی جو کہ باورچی خانے میں کھانا بنانے میں مشغول تھیں کہیں اس کی اس حرکت کو دیکھ نہ لیں ورنہ پھر اسے ماں کی ڈانٹ سننی پڑے گی۔

اب حقیقت کی دنیا اس کے سامنے تھی۔ اب تک تو وہ موبائل پر گیم کھیل رہا تھا اور اس میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت وڈیو گیم کے ہیرو کارٹون میں ضم ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس وقت تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ گریٹ کھلی سے بھی زیادہ طاقتور ہے، جس طرف کو بھی حملہ آور ہو جائے گا اس کے حریف منہ کے بل گرتے چلے جائیں گے اور بہت سارے تو اس کے جسم کے ہاؤ بھاؤ اور غضبناک تیور دیکھ اس کے سامنے ہتھیار ہی ڈال دیں گے۔ مگر اب تو ڈبل بیڈ سے گر کر اس کی یہ حالت ہو گئی کہ پوری طاقت لگا کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر کھڑا نہیں ہو پایا۔ اس کا چشمہ بھی دور جا گرا۔ وہ درد سے کراہتے کراہتے یہی سوچ رہا تھا کہ اب تو اسے امی کی لعنت وملامت سننی ہی پڑے گی۔

اتنے میں ہی امی کی آواز گونجی ’’ارے سعد کیا تم نے اسکول کا ہوم ورک کر لیا ابھی آ کر کاپی چیک کرتی ہوں۔‘‘

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی امی نے سوچا کہ شاید سعد کہیں چلا گیا ہوگا، وہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئیں کیونکہ اس کے پاپا بھی اب ظہرانے کے لیے آنے والے تھے اس لیے وہ جلدی جلدی کھانا پکانے کے کام کو مکمل کرنا چاہتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر امی کی آواز آئی۔ ’’سعد تم کہاں ہو؟ کیا اسکول کا کام مکمل ہو گیا۔‘‘

’’نہیں امی نہیں ہو پایا‘‘ درد کی شدت کی وجہ سے وہ زیادہ زور سے نہیں بول سکا۔

’’نہیں ہو پایا، کیوں نہیں ہو پایا‘‘ یہ کہتی ہوئی اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کا پاؤں سعد کے چشمے پر جا پڑا۔ چشمے کا شیشہ ٹوٹ کر ان کے پاؤں میں چبھ گیا اور ان کے پاؤں سے خون نکلنے لگا۔ اِدھر سعد بستر سے نیچے پڑا دونوں ہاتھوں سے اپنا پاؤں سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’ارے یہ کیا ہوا‘‘ اس کی امی کے منہ سے نکلا۔

’’کچھ نہیں امی، میں بستر سے نیچے گر گیا تھا‘‘ سعد آہستہ سے بولا۔ اس کی امی اپنے پاؤں کی تکلیف بھول گئیں۔

’’اچھا میں تمھاری سب حرکتوں کو سمجھتی ہوں ،اس کا مطلب یہ ہے کہ تم موبائل کے کسی گیم میں کامیاب ہو گئے ہو گے اور خوشی سے اچھل کود کرتے ہوئے گر پڑے، کیونکہ اس سے پہلے بھی تم ایسی حرکتیں کر چکے ہو۔‘‘

اب سعد نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی اگر وہ جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کرتا تو اس کی امی پٹائی بھی کر سکتی تھیں۔ امی نے بستر کا جائزہ لیا تو ایک طرف موبائل پڑا ہوا تھا اور ایک طرف وہ کاپی اور کتاب جو انھوں نے اب سے کچھ دیر پہلے اس کے بستے سے نکال کر دی تھیں مگر سعد نے سوچا تھوڑی دیر موبائل پر گیم کھیل لیا جائے اس کے بعد اسکول کا کام کر لوں گا مگر اسے کیا پتہ تھا کہ اس کا بھانڈا اس طرح پھوٹ جائے گا۔

امی نے سہارا دے کر اس کو کھڑا کیا، اُس کے پاؤں پر تیل کی مالش کی اور بستر پر لٹا دیا پھر اپنے پیر کا خون صاف کیا اور سعد کے ٹوٹے چشمے کی باقیات کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور سعد سے کہنے لگیں۔

”جانتے ہو پچھلے مہینے ڈاکٹر نے تمھاری آنکھوں کے بارے میں کیا کہا تھا، انھوں نے کہا تھا کہ اگر نظر کی کمزوری میں مزید اضافہ ہوا تو چشمہ لگانے کی بھی ساری گنجائش ختم ہو جائے گی اور آنکھوں میں لینس لگانا پڑے گا اور آنکھوں کے غلط استعمال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن یہ دنیا اندھیری ہو جائے گی ،اور چلنے پھرنے کے لیے بھی کسی اور کا سہارا لینا پڑے گا۔“

”امی آپ ٹھیک کہتی ہیں، آپ نے ہی بتایا تھا کہ موبائل گیم کھیلنے والے بچوں میں کئی طرح کے امراض پیدا ہو رہے ہیں اور ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے کیونکہ وہ زیادہ تر گوشہ نشین ہوتے ہیں اور گھر کے باہر کھیلوں میں حصہ نہیں لے پاتے ،اور کئی ملکوں نے تو اس طرح کے موبائل گیمس پر پابندی بھی لگا رکھی ہے جن کو کھیل کر بچوں میں اشتعال انگیزی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

سعد بستر پر لیٹا ہوا اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے اس کی امی کا پیر بھی زخمی ہو گیا تھا اور وہ خود بھی درد برداشت کر رہا تھا۔اس کے پاپا گھر میں داخل ہوئے تو ایک طرف سعد پیر کے درد سے کراہ رہا تھا دوسری طرف سعد کی امی اپنے پاؤں میں کپڑے سے پٹی باندھ رہی تھیں اور ان کے پیر سے نکلے ہوئے خون سے گھر کے فرش پر لال دھبے پڑ گئے تھے۔سعد کے پاپا نے یہ منظر دیکھا تو ڈر گئے اور دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھا یہ ماجرا کیا ہے؟

سعد کی امی نے کہا”موبائل گیم کی سرابوں کی دنیا کی نحوست“

اب وہ سمجھ گئے تھے کہ کیا معاملہ ہے لیکن آج سعد نے اپنے امی پاپا سے وعدہ کر لیا کہ وہ موبائل پر گیم کبھی نہیں کھیلے گا اور ساری توجہ اپنی پڑھائی پر دے گا اور سراب کی دنیا میں کبھی قدم نہیں رکھے گا۔

■

Mohd Ilyas
385, Peetal Bastee
Moradabad 244001- (UP)
Mob.: 9027455955

جہانگیر انس

غلط راستے کا مسافر

نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد دادا کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرتا ہے۔ ابا ان کے اکلوتے بیٹے ہیں جنھیں انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور اچھے اخلاق و آداب کا حامل بنایا ہے۔ ابا سرکاری محکمہ میں افسر ہیں۔ دادی کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

دادا دس پندرہ دنوں قبل نوکری سے سبکدوش ہوئے تو ابا نے ان سے کہا ''زندگی میں آپ نے بہت کام کیا ہے۔ اب آپ کو صرف آرام کرنا ہے۔''

ابا کی بات سن کر دادا نے فخر سے ابا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر مزاحیہ انداز میں بولے ''جہاں پناہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن خاکسار کو اتنی رعایت ملنی چاہیے کہ محلے کے غریب بچوں کو گھر بلا کر پڑھا سکوں، دوست احباب کی خاطر تواضع کر سکوں۔'' دادا اور ابا جب بھی بات کرتے پتہ ہی نہیں چلتا کہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ دادا کی بات سن کر ابا بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

ہم تین بھائی بہن ہیں۔ نسیمہ بڑی بہن ہے اور میں دادا کا سب سے چھوٹا پوتا ہوں۔ اکرم بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ دادا کے سبکدوش ہونے کے بعد ہم تینوں بھائی بہنوں کا زیادہ وقت دادا کے پاس ہی گزرتا ہے۔ ابا کا حکم بھی یہی ہے کہ ہمیں دادا کو تنہا نہیں چھوڑنا ہے اور ان کی ہر طرح کی خدمت کرنی ہے۔ ابا حکم نہیں بھی دیتے تو بھی ہم دادا سے کہاں دور رہنے والے تھے۔ وہ اتنے شفیق اور مہربان ہیں کہ ہم تو ان کے پوتے ہیں۔ اڑوس پڑوس کے بچے بھی ان کے آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں اور ان کی شفقت و محبت سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کا ناشتہ کر کے دادا گھر کے باہری صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتوار کا دن تھا، اسکول بند تھا اس لیے ہم تینوں بھائی بہن بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور ان سے لوڈو کھیلنے کی ضد کرنے لگے۔ ہماری اس معصوم خواہش پر دادا راضی ہوگئے اور وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ لوڈو کھیلنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد دادا کی عمر کا ایک شخص ان کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا حلیہ ایسا تھا کہ ہم تینوں بھائی بہن ڈر گئے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور گرد آلود، لمبے، بے ترتیب بال، بڑھی ہوئی داڑھی، ناخن اتنے بڑے بڑے جیسے انھیں کافی دنوں سے تراشا نہ گیا ہو، آنکھیں خون کی طرح سرخ، وحشت زدہ چہرہ، ہونٹوں پر پپڑی پڑی ہوئی۔ دادا نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے بدتمیزی سے دادا سے کہا ''کیوں بے رحیم، سٹھیا گیا ہے کہ بچوں کے ساتھ بچہ بنا ہوا ہے۔ ٹھیک ہی لوگ کہتے ہیں بوڑھوں اور بچوں میں فرق نہیں ہوگا۔ تیرے تو بڑے مزے ہیں سنا ہے کہ نوکری سے سبکدوش ہوگیا ہے۔ بڑا مال ملا ہوگا۔ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دے..... کیا تو بھول گیا کہ تیرا باپ میرے باپ کی فیکٹری میں نوکر تھا.....''

اس کی بے تکی باتیں سن کر ہمیں غصہ آ رہا تھا لیکن دادا اس کی باتیں نہایت ہی تحمل سے سن رہے تھے۔ جب وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا تو دادا نے نہایت ہی اپنائیت اور نرمی سے کہا ''تیری باتیں ختم ہوگئی ہیں تو آرام سے بیٹھ جا۔ میں پانی منگاتا ہوں، منھ ہاتھ دھو لے اور ناشتہ کر لے۔ اس کے بعد دادا نے ہمیں حکم دیا ''مہمان کے لیے اندر سے پانی اور ناشتہ لے آؤ'' ہم پانی لے آئے اور نسیمہ نے ٹیبل پر ناشتہ سجا دیا۔ اس نے جگ کے پانی سے منھ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کرنے لگا۔ اس کے کھانے کا انداز ایسا تھا جیسے کئی وقت کا بھوکا ہو۔ جب تک وہ ناشتہ کرتا رہا دادا افسوس ناک نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر ہمدردی کے ساتھ رنج و غم کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

جب وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو دادا نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ہمیں حکم دیا کہ اندر جا کر لوڈو کھیلو۔ ہم اندر چلے گئے۔ دادا بہت دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی باتیں سننے کی ہم بھائی بہنوں نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکے، کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر جانے لگا تو دادا نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اسے دیا اور کچھ دور تک اس کے ساتھ گئے۔

جب دادا واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ہم دادا کے پاس آئے، وہ خاموش بیٹھے خلا میں دیکھ رہے تھے۔

نسیمہ نے دادا سے پوچھا ''آپ خاموش بیٹھے خلا میں کیا تلاش کر رہے ہیں۔ یہ شخص کون تھا، اس کا حلیہ اتنا خراب کیوں تھا اور آپ سے اتنی بدتمیزی سے کیوں بات کر رہا تھا؟

ایک ہی ساتھ اتنے سوال سن کر دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، انھوں نے کہا جب ''سوال کرنے میں تمھاری سانس پھولنے لگی ہے تو جواب دینے میں مجھ بوڑھے کا کیا حال ہوگا۔''

دادا کے مزاحیہ انداز گفتگو پر نسیمہ کے ساتھ ہم دونوں بھائی بھی ہنس پڑے۔ جب ہماری ہنسی کا دور ختم ہوا تو دادا نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا ''تمھارے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میں خلا میں کچھ تلاش نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ سوچ رہا تھا کہ جہالت، بری صحبت و بری عادت انسان کو کس قدر نچلے پائیدان تک پہنچا دیتی ہے۔''

اس کے بعد دادا نے اس شخص کے متعلق تفصیل سے بتایا ''اس کا نام عزیز احمد ہے، یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اس کے والد سعید احمد ایک امیر و کبیر شخص تھے۔ گاؤں میں ان کی

کافی زمین تھی۔ شہر میں کپڑا بنانے کی فیکٹری تھی۔ میرے ابا یعنی تم لوگوں کے پردادا ان کی فیکٹری میں منشی (مینجر) تھے۔ فیکٹری کے کیمپس میں ملازمین کے لیے کئی کوارٹر بنے ہوئے تھے، جن میں سے ایک کوارٹر میں ابا اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ سعید احمد کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ عزیز احمد ان کا اکلوتا لڑکا ہے، گھر کی ذمے داری سعید احمد کی لاولد بیوہ بہن سنبھالتی تھیں۔ نہایت ہی شفیق اور ہمدرد خاتون تھیں۔

بچپن میں عزیز احمد ایک اچھا اور نیک لڑکا تھا، گھر میں چند نوکروں اور پھوپھی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے وہ اکثر کھیلنے کے لیے میرے پاس چلا آتا۔ تمھاری پردادی اس سے بہت پیار کرتیں یہ بھی ان کی بہت عزت کرتا۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں سمجھتیں۔ ہم دونوں آپس میں بہت پیار و محبت سے رہتے۔ ایک ساتھ ہی کھیلتے اور ایک ساتھ ہی اسکول جاتے۔ پرائمری درجات کی تعلیم ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ حاصل کی، جب ہماری عمر دس سال ہوگئی تو ہمارے راستے جدا ہوگئے، عزیز احمد کو اس کے والد نے ایک بہت بڑے اسکول میں داخل کر دیا اور اس اسکول کے ہاسٹل میں وہ رہنے لگا۔ میرا داخلہ مقامی سرکاری ہائی اسکول میں ہوا۔ جس اسکول میں عزیز احمد کا داخلہ ہوا تھا، اس اسکول میں امیر و کبیر گھرانے کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے کیونکہ اس کی فیس ادا کرنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

اسکول کی چھٹیوں کے دنوں میں عزیز احمد گھر آتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا، لیکن رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آنے لگی۔ اب وہ گھر آتا تو مجھ سے ملنے نہیں آتا کہیں راستے میں ملاقات ہو جاتی اور میں اس کی تعلیم کے متعلق پوچھتا تو میری بات کو نظر انداز کر کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتا، اپنے سیر و سپاٹے اور فضول خرچی کی داستان فخر سے سنانے لگتا۔ میں اسے تعلیم کی طرف دھیان دینے کی بات کرتا تو میرا مذاق اڑانے لگتا،

مجھے کنواں کا مینڈک کہتا، وقت کے ساتھ وہ ان تمام برائیوں کا شکار ہوتا گیا جو انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔

عزیز احمد کے والد بوڑھے ہوگئے تھے۔ دل کے مریض بھی تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کاروبار سنبھال لے، لیکن اس کی موجودہ روش دیکھ کر پریشان اور غم زدہ رہنے لگے تھے۔ سمجھانے کی کوشش کرتے تو انھیں جھڑک دیتا۔ واحد اولاد و وارث تھا، اس لیے کوئی سخت قدم اٹھانے سے مجبور تھے۔ سب کچھ برداشت کررہے، لیکن کب تک؟ ایک دن ایسے سوئے کہ سوئے رہ گئے۔

جب تک والد زندہ تھے عزیز احمد کچھ نہ کچھ لحاظ کرلیتا لیکن ان کے مرنے کے بعد بالکل آزاد ہوگیا۔ اس نے تعلیمی سلسلہ منقطع کردیا۔ والد کی موت کے چند دنوں بعد پھوپھی بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ روکنے ٹوکنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ دن رات عیش و عشرت اور شراب و کباب میں غرق رہنے لگا۔ آوارہ مطلب پرست دوستوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگا۔ پہلے گاؤں کی زرعی زمین فروخت ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کپڑے کی فیکٹری بھی کوڑی کے مول بک گئی۔ یہاں تک کہ رہائشی مکان بھی فروخت ہوگیا۔ عیش و عشرت اور شراب و کباب میں اس طرح غرق تھا کہ شادی کرنے اور گھر بسانے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا تو محل سے سڑک پر آگیا۔ برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ آوارہ اور مطلب پرست دوست کب ساتھ دینے والے تھے۔ مارا مارا پھرنے لگا۔ کوئی دے دیتا تو کھالیتا، کہیں خالی جگہ مل جاتی تو سو لیتا۔ محنت و مشقت سے بگڑی بنانے کے بجائے خود کو حالات کے حوالے کردیا۔

میں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ہائی اسکول میں نوکری حاصل کرلی اور اپنے پرانے شہر کو چھوڑ کر اس شہر میں آگیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی کرتے کرتے صدر مدرس کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ایک دن میں اسکول سے پیدل ہی گھر آرہا تھا کہ اچانک اس سے ملاقات ہوگئی، میں اس کی ظاہری حالت دیکھ کر پہچان نہیں سکا، لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے حالات جان کر مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ میں نے اسے سہارا دینے کی پیشکش کی لیکن اس نے انکار کردیا، جسے شراب کی عادت پڑ جاتی ہے اسے سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اسے گھر لے آنا چاہا لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔ میں نے اسے اپنے اسکول کا نام بتایا۔ وہ گھر نہیں آتا لیکن کبھی کبھی اسکول میں چلا آتا لیکن اندر کبھی نہیں آتا، اسکول کے باہر ہی مجھے چپراسی سے کہہ کر بلوا لیتا، یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلا، اس کے بعد اس نے اسکول پر بھی آنا بند کردیا۔ آج جب اسکول پر ملنے آیا تو چپراسی نے بتایا میں ریٹائر ہو چکا ہوں، پتہ لگاتے ہوئے گھر پر آگیا۔

دادا نے اپنی بات ختم کرکے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ہم تینوں بھائی بہن خاموشی سے ان کی بات سن رہے تھے، اور سوچ رہے تھے، جہالت، بری صحبت اور نشے کی عادت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اسی لیے ہمارے بزرگ تعلیم حاصل کرنے، بری صحبت سے دور رہنے اور نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب نے بھی نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔

■

Jahangeer Uns (Mojibur Rahman)
At.: Rani Pur, Po: Koirigawan
Siwan - 841232 (Bihar)
Mob.: 9162357830

سفر مسلسل

شاہ تاج خان

اسکول سے آتے ہی مرتضٰی اپنی باجی رفیعہ کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔

''باجی! جب ہم کچھ نگلتے ہیں تو ہمارا کھانا آواز کی نالی میں کیوں نہیں جاتا؟ جبکہ غذائی نالی تو آواز کی نالی کے پیچھے ہوتی ہے۔ پھر کھانا غذا کی نالی میں ہی کیسے جاتا ہے؟'' رفیعہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''سب سے پہلے تو یہ جان لیجیے کہ غذا کو جسم میں داخل کرنے کو نگلنا (ingestion) کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آواز کی نالی کے اوپر ایک فلیپ ٹائپ عضو ہوتا ہے۔ یہ زبان کے بالکل آخر میں ہوتا ہے۔ اسے لسان المزمار یا مکب (Epiglottis) کہتے ہیں۔ کچھ بھی نگلنے کے دوران اپیگلوٹس ہمارے ونڈ پائپ کو ڈھک دیتا ہے تو کھانا سیدھے فوڈ پائپ میں چلا جاتا ہے۔'' رفیعہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''باجی آپ مجھے سمجھا رہی ہیں یا الجھا رہی ہیں؟ لگتا ہے مجھے آج کے سوالوں کا جواب ماموں جان کے پاس جا کر ہی ملے گا۔'' مرتضٰی نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ صحیح رہے گا۔ کبھی کبھی تمھارے سوالوں کے جواب دینا میرے بس کی بات نہیں ہوتی۔'' رفیعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی باجی! آج میرے دماغ میں بہت سارے سوال ہیں اور اپنے پروفیسر ماموں جان کے پاس میرے ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ فون کر کے وقت لے لیتے ہیں۔ کیا آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی؟'' رفیعہ نے کہا۔

''جی! ماموں جان نے بتایا تھا کہ انھوں نے کچھ ورکنگ ماڈل تیار کیے ہیں۔ میں ان سے کل ملنے جانے والی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ اب جب تک تمھیں سوالوں کے جواب نہیں مل جائیں گے تب تک تمھیں نیند نہیں آئے گی۔ ایسا کرو کہ تم ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاؤ تب تک میں ماموں جان سے بات کر

لیتی ہوں۔" رفیعہ نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی باجی!" مرتضیٰ ساتویں کلاس میں اور رفیعہ گیارہویں کلاس میں پڑھتے ہیں۔ دونوں ہی سائنس میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ریاض ماموں کی وجہ سے بچپن سے ہی انھیں سائنس کے ماڈلوں سے کھیلنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ ریاض خان کالج میں حیاتیات کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے گھر میں ایک چھوٹی سی لیب بھی رکھی ہے۔ جہاں رکھے مختلف ورکنگ ماڈل رفیعہ اور مرتضیٰ کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

"شام پانچ بجے ہم ماموں جان کے یہاں جا رہے ہیں۔ تیار رہنا۔" رفیعہ نے بتایا تو مرتضیٰ نے کہا۔

"ابھی تو صرف دو ہی بجے ہیں۔ کیا ہم جلدی نہیں جا سکتے؟" مرتضیٰ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

"نہیں! ہمیں دوسروں کے وقت اور آرام کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ جو وقت دیا ہے ہم اسی وقت جائیں گے اور ہاں امّی کا فون آیا تھا کہ آج انھیں آفس سے آتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ اِس لیے اپنا ہوم ورک خود کر لیجیے گا۔ کوئی مدد چاہیے تو مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔" رفیعہ نے بات مکمل کی اور اپنے کمرے کی جانب مڑ گئی۔ مرتضیٰ نے بھی اپنا بستہ اٹھایا اور اسکول کا کام کرنا شروع کر دیا۔ پانچ بجنے والے تھے تو دونوں بھائی بہن نے گھر کو تالا لگایا اور ماموں جان کے گھر کی جانب چل دیے۔ دروازے پر دستک دی تو ماموں ریاض نے دروازہ کھولا اور دونوں کو خوش آمدید کہا۔

"ہاں بھئی! آج کہاں الجھ گئے مرتضیٰ؟" ماموں ریاض کی بات پر مرتضیٰ نے کہا۔

"آج ہمیں انسانی نظامِ انہضام (human digestive system) پڑھایا گیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ باتیں تو آ گئیں لیکن میں غذا کے اِس پورے سفر کو آپ کے بنائے ماڈل کے ذریعے سے سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ مجھے رٹنا نہ پڑے۔ آپ کے پاس نظامِ انہظام کا ماڈل تو ہے نا؟ جس میں پوری تفصیلات ہوں۔" مرتضیٰ نے تفصیل سے اپنی بات بتائی۔

"جی برخوردار! بالکل موجود ہے۔ تو سیدھے لیب میں چلتے ہیں۔ بنا وقت گنوائے۔" ریاض ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ماموں جان! کیا میں ماڈل کی مدد سے کچھ باتیں سمجھانے کی کوشش کروں؟" رفیعہ نے اجازت مانگی۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ تو شروع کریے۔" ریاض ماموں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو رفیعہ نے اپنی بات شروع کی۔

"ہماری غذا کا سفر منہ (Mouth) سے شروع ہوتا ہے، جسے جوفِ دہن (Buccal cavity) کہتے ہیں۔ جہاں پر دانتوں کی مدد سے کھانے کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور پھر ہماری زبان کھانے کو غذائی نالی (Food pipe) کی طرف بھیج دیتی ہے، جسے Oesophagus کہتے ہیں۔ اِس کی لمبائی تقریباً دس سے تیرہ اِنچ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ غذائی نالی منہ سے معدہ تک ہوتی ہے۔" رفیعہ نے ماڈل پر دکھا کر سمجھاتے ہوئے بتایا اور ماموں جان کی طرف دیکھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا نہیں۔ ریاض ماموں نے گردن ہلا کر بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"ہمارے معدے (Stomach) میں یہ کھانا تین سے چار گھنٹے تک رہتا ہے۔ اُس کے بعد ہماری غذا اگلے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوتی ہے، اور یہ جو گچھے کی شکل میں بل کھاتا پائپ سا نظر آ رہا ہے اسے چھوٹی آنت (small intestine) کہتے ہیں۔ نام تو اس کا چھوٹی آنت ہے لیکن اِس کی لمبائی تقریباً 6 میٹر ہوتی ہے۔ اِس کے بعد ہماری غذا بڑی آنت (Large intestine) سے ہو کر ریکٹم (Rectum) کی جانب بڑھ جاتی ہے۔ بڑی آنت کی لمبائی بھی تقریباً 1.5 میٹر ہوتی ہے اور

سب سے آخر میں غیر ضروری فضلہ (Waste material) مبرز (Anus) کے ذریعے جسم سے باہر کر دیا جاتا ہے۔'' رفیعہ نے اپنی بات ختم کی تو ریاض ماموں نے کہا۔

''اِس پورے سفر کو دائرہ ہاضمہ (Gut/alimentary canal) کہتے ہیں۔ یہ سفر تقریباً نو میٹر لمبا ہوتا ہے۔'' کافی دیر سے ماڈل اور رفیعہ کی باتیں سن رہے مرتضٰی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اتنا لمبا سفر! میرے چھوٹے سے جسم میں غذا کے سات اسٹیشن اور چار سے پانچ گھنٹے کا تقریباً نو میٹر طویل سفر۔ یہ ہوئی نا بات۔ اب سمجھا کہ ہمیں ہر وقت بھوک کیوں نہیں لگتی! کیونکہ کافی وقت تک کھانا ہمارے پیٹ میں ہی رہتا ہے۔ اچھا یہ بتایئے کہ ہم کچھ بھی کھائیں تو وہ نیچے کی طرف ہی کیوں جاتا ہے؟ کیا اِس میں مرکز ثقل (Gravity) کا کوئی رول ہوتا ہے؟'' مرتضٰی کے سوال اب شروع ہو گئے تھے۔

''نہیں! ہم جب بھی کچھ کھاتے ہیں وہ ہر صورت میں نیچے ہی جائے گا۔ لیکن اِس میں گریویٹی کا کوئی رول نہیں ہے۔ کھانے کا نیچے کی جانب سفر کرنے کو حرکتِ دودیہ (Peristaltic movement) کہتے ہیں۔ جب ہم کچھ نگلتے ہیں تو ہماری غذائی نالی پھیلتی اور سکڑتی (Contracted/ expanded) ہے۔ غذائی نالی میں غذا کی حرکت اُس کی دیوار کی عضلاتی پرت کے سکڑنے سے عمل میں آتی ہے۔ جس سے غذا نیچے کی جانب جاتی ہے۔'' ریاض ماموں تھوڑا رک کے تو مرتضٰی نے پوچھا۔

''پھر ہمارا کھانا واپس منہ میں کیوں نہیں آجاتا؟ جیسے نیچے گیا ویسے اوپر بھی تو آسکتا ہے؟ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا؟'' ریاض ماموں نے مرتضٰی کو شاباشی دی اور کہا

''کیونکہ ہماری اِن تمام نالیوں میں جگہ جگہ پر عاصرہ (Sphincter) لگے ہوتے ہیں۔ جو راستہ بند کر دیتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا عضلہ ہوتا ہے جس کے سکڑنے سے سوراخ بند ہو جاتا ہے۔'' مرتضٰی نے کہا۔

''اتنا میری سمجھ میں آیا کہ جو اندر گیا اب اسے واپس آنے کی اجازت نہیں ہے۔ شرافت سے اپنے راستے چلتے جانا

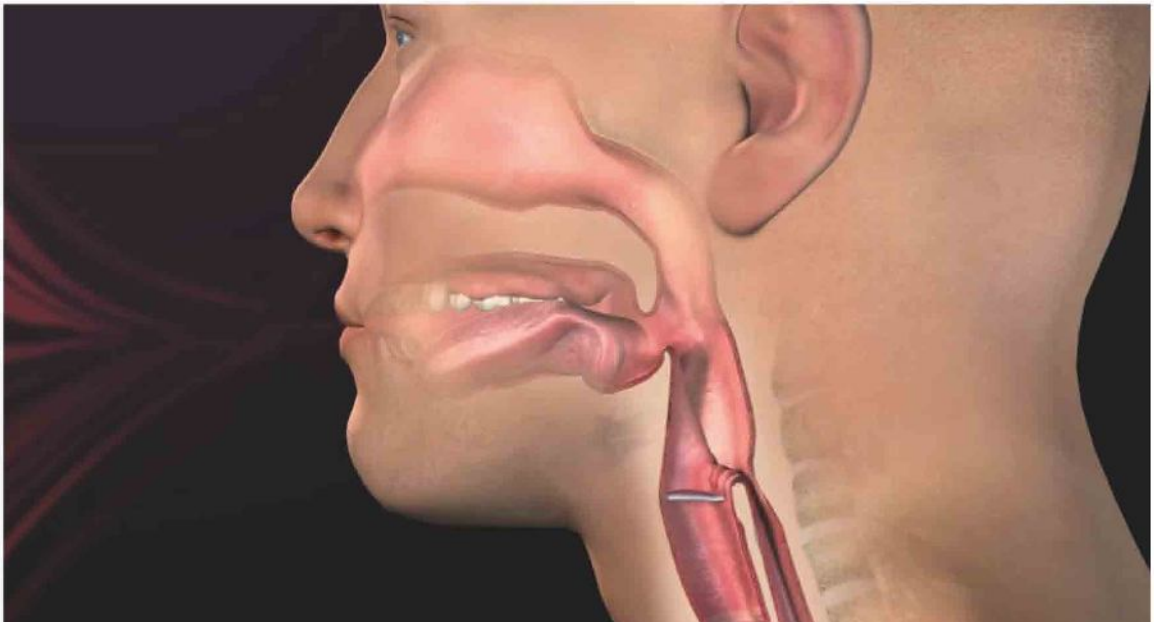

ہے۔ کیونکہ پیچھے جانے کے راستے بند ہوگئے ہیں۔'' رفیعہ اور ریاض ماموں اُس کی بات سُن کر ہنسنے لگے اور رفیعہ نے کہا۔

''جی ہیرو! آپ کو بات سمجھ میں آگئی ہے۔ اصطلاحات کو ابھی یاد کرنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ماموں جان؟'' رفیعہ کی بات پر ریاض ماموں نے کہا۔

''جی رفیعہ! یہ اصطلاحات تو دھیرے دھیرے یاد ہو جاتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر بات کو اگر پریکٹکل کے ذریعے سیکھا جائے تو آگے پریشانی نہیں ہوتی۔ جیسے ہم ورکنگ ماڈل کی مدد سے غذا کے پورے راستے کو بہتر طریقے سے سمجھ پا رہے ہیں۔'' مرتضیٰ نے کہا۔

''جی ماموں جان! اچھا یہ تو بتائیے کیا بس یہی سات اعضاء ہمارے کھانے کو ہضم کرنے میں محنت کرتے ہیں یا کچھ اور بھی اعضا اِن کی مدد کرتے ہیں؟'' ریاض ماموں نے ماڈل میں دکھاتے ہوئے کہا

''جگر (Liver)، پتہ (Gallbladder) اور لبلبہ (Pancreas) بھی اہم رول نبھاتے ہیں۔'' مرتضیٰ نے فوراً سوال کیا۔

''آپ نے ان سب کے کاموں کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟'' ریاض ماموں نے مرتضیٰ کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''برخوردار! آپ کے لیے اتنی معلومات کافی ہیں۔ پہلے یہ سبھی نام یاد کر لیجیے پھر اِن کے کاموں پر تفصیل سے بات کریں گے۔'' ماموں جان کی بات سُن کر مرتضیٰ کا منہ لٹک گیا تھا۔ رفیعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ماموں جان! مرتضیٰ کے سوال جب شروع ہوتے ہیں تو وہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ اکثر میں پریشان ہوجاتی ہوں۔'' ریاض ماموں نے کہا۔

''سوال پوچھنا بہت اچھی عادت ہے۔ لیکن جواب دینے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عمر کے حساب سے بات کی جائے۔ تا کہ ذہن پر کوئی بوجھ نہ پڑے اور اب آپ لوگ گھر جائیے۔ مجھے اپنے کل کے لیکچر کی تیاری کرنی ہے۔'' رفیعہ اور مرتضیٰ نے ماموں جان کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی جانب چل دیے۔

(تعارف مارچ 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے)

■

Shahtaj Khan
588/2b, Hayat Manzil
Plot No.: 40, Flat No.: 4
New Era Society, Marketyard
Pune - 411037 (Maharashtra)

کہانی

تفضل جمال

ننھی کھلونے والی

آج ہفتے کا پہلا دن تھا اور مجھے آفس جلدی جانا تھا۔ میرا آفس ناگپور شہر میں اتواری، گاندھی باغ میں واقع ہے۔ جہاں ہم کمپیوٹرس کو بنانے اور بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ آفس جانے کے لیے میرے پاس ایک موٹر سائیکل ہے۔ میں اپنی موٹر سائیکل کو صاف کرنے لگا۔ تبھی گھر کے اندر سے آواز آئی ٹفن باکس تیار ہے، ساتھ لے جانا مت بھولنا۔ میں نے موٹر سائیکل صاف کرتے کرتے آواز لگائی۔ ہاں..... ہاں..... مجھے یاد ہے، نہیں بھولوں گا۔ میں گاڑی صاف کر ہی رہا تھا ادھر میری امی میرا ٹفن باکس اور بیگ لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ گاڑی صاف کرنے کے بعد میں نے امی سے ٹفن باکس لیا، اس کو بیگ میں ڈالا۔ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اپنے امی کو سلام کیا، دعائے سفر پڑھی اور آفس کے لیے گھر سے روانہ ہو گیا۔

ناگپور آفس جانے کے لیے کامٹی سے دو راستے جاتے ہیں۔ ایک کلمنہ روڈ سے اور دوسرا نیشنل ہائی وے نمبر 7 جسے جبل پور ناگپور یعنی جے این روڈ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ کلمنہ روڈ پر دو سے تین ریلوے لائن ملتی ہیں جس پر اکثر ایک یا دونوں ریلوے پھاٹک بند ملتا ہے۔ پھاٹک بند ملنے کی صورت میں اکثر آفس جانے میں دیر ہو جایا کرتی ہے۔ اس لیے وقت بچانے کے لیے اکثر بڑے روڈ یعنی جے این روڈ سے جایا کرتا تھا۔ اس روڈ پر کافی سارے پٹرول پمپ، کار شو روم اور بہت ساری چھوٹی بڑی کمپنیاں موجود ہیں۔ اس روڈ پر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں جس سے یہاں کافی چہل پہل رہتی ہے۔ خیر..... مجھے کامٹی سے آفس جانے کے لیے نیشنل ہائی

وے نمبر 7 پر سب سے پہلا روڈ سگنل شاردہ کمپنی پر پڑتا تھا۔ اس جگہ چار نہیں بلکہ پانچ راستہ چوک واقع ہے۔ اس لیے یہاں کا سگنل کچھ زیادہ ہی وقت کے لیے بند رہتا ہے۔ یہ میرا روز کا معمول تھا اور جب بھی سگنل بند ہوتا تو یہاں کے چوراہے پر لوگ کچھ نہ کچھ چیزیں بیچتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ میں اکثر یہاں کچھ بڑے مرد عورت اور چھوٹے معصوم بچوں کو دیکھا کرتا تھا جو روڈ سگنل کے بند ہونے پر چھوٹے بڑے کھلونے، غبارے اور دیگر اشیا بیچا کرتے تھے۔ میں نے آج تک ان لوگوں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ یہ لوگ کہاں سے آتے ہیں اور یہاں کھلونے وغیرہ کیوں بیچتے ہیں۔ کبھی ان لوگوں کی وجوہات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی نہ ہی ان کے سبب کو جاننے کی..... خیر.....! میں ہر روز یہاں سے گزرتا، کبھی سگنل بند ملتا تو رک جاتا اور سگنل کھلا ہوتا تو نکل جایا کرتا تھا۔ مگر کبھی بھی ان لوگوں سے کچھ نہیں خریدتا۔

ایک روز کی بات ہے مجھے دو جگہ کمپیوٹر کا انسٹالیشن کرنا تھا، میں آفس کے لیے جلدی نکل گیا۔ جیسے ہی میں شاردہ کمپنی کے پاس پہنچا دیکھا سگنل کی لائٹ پیلی ہوگئی اور کچھ ہی لمحے میں لال..... جسے دیکھتے ہی میں اپنی موٹر سائیکل کی رفتار کم کرتا ہوا عین سگنل کے پاس زیبرا کراسنگ کے پہلے جا کھڑا ہوا۔ موٹر سائیکل بند کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے کافی لوگ اس سگنل پر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ تبھی سگنل کے ایک طرف سے کچھ افراد ہاتھوں میں کھلونے اور غبارے لیے آتے نظر آئے۔ ان لوگوں میں سے ایک چھوٹی بچی بھی تھی جو نہایت ہی معصوم اور بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر تھوڑی گندگی لگی تھی اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا شاید اس کے ماں باپ نہیں ہوں گے یا پھر کسی مجبوری کے تحت ایسا کام کر رہی ہوگی۔ اس کے ننھے ہاتھوں میں کچھ کھلونے اور غبارے تھے۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں کھلونے اور غبارے لیے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ میں روز اس راستے سے گزرا کرتا تھا لیکن کبھی ان لوگوں پر دھیان نہیں دیا، مگر آج اس ننھی لڑکی کو دیکھ کر اسے دیکھنے کا من کر رہا تھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا اور میری نظر اس پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ وہ کیا کر رہی ہے کہاں جا رہی ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔ وہ ہر گاڑی والے کے پاس جاتی اپنے ننھے ہاتھوں سے کھلونے اور غبارے اٹھاتی اور بھیڑ میں لوگوں کو خریدنے کو کہتی۔ وہ ہر ایک گاڑی والے کے پاس جاتی اور کہتی..... بابو جی کھلونے لے لو..... غبارہ لے لو..... کھلونے لے لو..... غبارہ لے لو.....؟ مگر کوئی اس بچی سے نہ ہی کھلونے لیتا اور نہ ہی غبارہ..... وہ جس جس کے پاس جاتی ہر گاڑی والا اسے آگے جانے کو کہتا یا پھر خود آگے نہ کہہ کر بڑھ جاتا۔ مگر وہ ایک ایک کر کے ہر گاڑی کے پاس جاتی اور آواز لگاتی..... بابو جی..... کھلونے لے لو..... غبارہ لے لو..... کھلونے لے لو..... غبارہ لے لو.....؟ ابھی تک کسی نے بھی اس لڑکی سے کچھ نہیں لیا تھا۔ وہ مایوس ہونے لگی اور سب کے پاس سے ہوتے ہوئے گھومتے گھومتے میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے ترستی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ہچکچاتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ با... با... بابو جی کھلونے لے لو..... غبارہ لے لو.....؟؟ میں بھی ان باقی لوگوں کی طرح اس ننھی لڑکی کو نظر انداز کرتے ہوئے نہیں میں سر ہلا دیا اور ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ دوبارہ مجھ سے کہنے لگی، بابو جی کچھ لے لو..... کچھ تو لے لو.....؟ بابو جی..... گھر میں چھوٹے بچوں کے لیے غبارہ ہی لے لو.....! میں نے پھر دوبارہ نفی میں سر ہلایا اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور اس لڑکی سے کچھ نہ خریدا.....! اب وہ

مایوس ہوگئی۔ سگنل کھلنے ہی والا تھا۔ وہ چاروں طرف نظر گھمائی اور مایوس ہو کر نظریں نیچے کیے اسی جگہ جانے لگی جہاں سے وہ اٹھ کر آئی تھی۔ وہ واپس اپنی جگہ جا پہنچی اور ایک فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ گئی۔ سگنل کھلا سب نے اپنی گاڑی شروع کی اور جانے لگے۔ میں نے بھی اپنی گاڑی شروع کی اور آفس کے لیے نکل گیا مگر آگے بڑھ کر ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر اسے دیکھا وہ اپنا معصوم سا چہرہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ میں جیسے جیسے سگنل سے دور ہوتا جا رہا تھا میری آنکھوں کے سامنے وہ سگنل اور ننھی کھلونے والی لڑکی کا منظر نظر آ رہا تھا۔ میں جب تک آفس نہیں پہنچا میرے دل و دماغ میں اس لڑکی کا چہرہ بسا ہوا تھا۔

آج نہ جانے کیوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ کبھی لگتا تھا جیسے میں نے اس ننھی لڑکی کا دل دکھا دیا ہو..... میں آفس جانے تک سارے راستے یہی سوچتا رہا، کہ کاش.....!! مجھے اس لڑکی سے کچھ غبارے ہی لے لینا تھا۔ مگر افسوس.....! میں اس سے کچھ نہ خرید سکا۔ آج میرا دل کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لڑکی کا تصور دماغ میں بسا ہوا تھا۔ میں نے بھی عہد کیا کہ اب اگلی بار اس سگنل پر ضرور رکوں گا اور اس ننھی کھلونے والی سے کچھ نہ کچھ خریدوں گا۔

اگلی صبح میں آفس کے لیے گھر سے نکلا مگر آج راستہ بھی جیسے طویل لگ رہا تھا۔ اس ننھی کھلونے والی کو دیکھنے کی میرے دل میں ایک امنگ تھی۔ مجھے اسے ملنے کی تڑپ ہونے لگی اور میں اپنی موٹر سائیکل بھی کچھ تیز ہی چلا رہا تھا۔ جیسے ہی میں شاردہ کمپنی پہنچا تو دیکھا..... آج سگنل شروع تھا، مگر میں نے جان بوجھ کر گاڑی کی رفتار کم کردی تا کہ اس لڑکی سے مل سکوں اور جیسے ہی سگنل لال ہوا میں رک گیا۔ سگنل پر اپنی نظریں دائیں بائیں گھمانے لگا اور اس ننھی کھلونے والی کو ڈھونڈنے لگا۔ مگر وہ آج کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ اب میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور میرے دل میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے۔ وہ کیوں نہیں آئی..... کہاں گئی ہوگی..... کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا..... وغیرہ وغیرہ..... میری نظریں اسے ہر طرف ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ کہیں نہیں نظر آئی.....؟

آج بھی جب میں شاردہ کمپنی کے سگنل پر آتا ہوں ننھی کھلونے والی کو ہی ڈھونڈتا ہوں، مگر وہ مجھے اس دن کے بعد کبھی بھی نظر نہیں آئی۔ میرے دل میں آج بھی اس ننھی کھلونے والی کا خیال رہتا ہے کہ کبھی وہ مجھے نظر آجائے اور میں اس سے کچھ خرید لوں...

آج کل ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کا بلا وجہ نقصان کر کے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ ان لوگوں سے اچھے تو یہ لوگ ہیں جو ریڈ سگنل پر اپنا ساز و سامان بیچتے ہیں اور کچھ پیسے کما لیتے ہیں۔ محنت و مشقت کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ محنت و مشقت انھیں پسند ہے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا ان کے لیے باعث شرم ہے۔

کیوں نہ ہم سب بھی ان لوگوں سے کچھ نہ کچھ خرید لیا کریں۔ جس سے ان لوگوں کے گھر خرچ کا پیسہ نکل جائے اور کچھ آمدنی بھی ہو۔ کیا پتا ان لوگوں کی کیا مجبوری ہے۔ شاید یہ وہی لوگ ہیں جنھیں محنت کرنا پسند ہے، مگر بھیک مانگنا نہیں...

(کوائف مئی 2022 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Tafazzul Jamal
Waris Pura
Kamptee - 441001 (Maharashtra)
Mob.: 9021132527

ریان اور طوطا

شاداب ابراھیم

گرمی کا موسم تھا، سخت گرمی تھی، درختوں کے پتے تک نہیں ہل رہے تھے، پرندے اِدھر اُدھر سر چھپاتے پھرتے تھے، کیڑے مکوڑے بھی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے بلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ مکھیاں تک گرمی سے پریشان تھیں، صبح شام ہی موسم میں کچھ خنکی رہتی تھی، لوگوں کو اسی وقت راحت محسوس ہوتی تھی اور کھیت کھلیان کی طرف نکلتے تھے۔

گاؤں کے بچے بھی صبح شام اپنی اپنی سائیکلیں، فٹ بال، بیڈمنٹن، ہاکی اسٹک، بَیٹ بال وغیرہ لے کر میدان پہنچتے تھے، سرکاری میدان کے چاروں طرف باغات تھے، زیادہ تر آم اور جامن کے درخت تھے، ایک دو امرود کے درخت بھی تھے، جس کی وجہ سے دوپہر میں وہاں کچھ راحت محسوس ہوتی تھی، پرندوں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا، کوئل و بلبل، طوطا و مینا اور پپیہا کی آوازوں کے امتزاج سے ایک حسین نغمہ پیدا ہو جاتا تھا، کانوں میں رس گھلنے لگتا تھا، سانسوں میں تازگی محسوس ہوتی تھی، ذہن کو سکون ملتا تھا، دل کے تار جھنجھنانے لگتے تھے۔

صبح، شام بچوں سے میدان کھچاکھچ بھرا رہتا تھا، بچے الگ الگ ٹولیوں میں مگن رہتے تھے، کوئی فٹ بال کھیلتا تو کوئی والی بال، کسی کے ہاتھ میں بیڈمنٹن ہوتا تو کوئی ہاکی اسٹک لے کر دوڑ رہا ہوتا، کبڈی اور گلی ڈنڈے جیسے کھیل بھی ہوتے تھے، کچھ بچے سائیکل چلانے اور سیکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے بار بار گرتے اور اٹھتے تھے۔

ریان کے والد نے بھی سائیکل خرید دی تھی، وہ بھی پچھلے ایک مہینے سے سائیکل لے کر میدان پہنچتا تھا اور سائیکل سیکھنے کی کوشش کرتا تھا، روزانہ وہ گرتا، چوٹ کھاتا، پھر بھی وہ ابھی تک سائیکل چلانا نہیں سیکھ پایا تھا، آج بھی وہ صبح سویرے سائیکل لے کر نکلا اور دھوپ کی شدت تک وہ سائیکل چلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا اور بالآخر مایوس ہو کر ایک آم کے درخت کے نیچے جا بیٹھا، سر جھکا کر کافی دیر تک بیٹھا رہا، دل ہی دل میں وہ آئندہ کبھی سائیکل نہ چلانے کا عہد کر رہا تھا، درمیان میں کبھی کبھی نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا، پھر نگاہ جھکا لیتا، جس درخت کے نیچے وہ بیٹھا تھا اسی درخت پر ایک طوطا بھی بہت دیر سے بیٹھا تھا اور ریان کو غور سے دیکھ رہا تھا، ایک دو مرتبہ اس نے ٹائیں ٹائیں بھی کیا، پھر بھی ریان اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا، جس کی وجہ سے ریان کے سلسلہ میں اس کا تجسس اور بھی بڑھ گیا، طوطا اڑا اور ریان کے قریب ایک شاخ پر آ بیٹھا، اور ٹائیں ٹائیں کر کے ریان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن متوجہ نہیں کر سکا تو اور قریب آ گیا اور ریان کو ٹوکتے ہوئے کہا:

ارے بچے! کیا بات ہے؟ کیوں مایوس ہو؟

ریان نے نگاہ اٹھائی، طوطے کو دیکھا اور سر جھکا لیا، طوطے نے دوبارہ پوچھا: ارے بچے! کیوں مایوس ہو کیا بات ہے؟

جاؤ بھائی! کیوں جلے پر نمک چھڑکنے آگئے ہو۔ ریان نے منہ لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے مایوسی کی وجہ بتاؤ! میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ طوطے نے ریان کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

ارے میاں! تم میری مایوسی کیسے دور کروگے؟ ریان نے پوچھا۔

بتاؤ تو سہی، دوست سمجھ کر ہی بتاؤ، دور کرنے کی کوشش کروں گا، یا ہم دونوں مل کر اس کا کوئی حل نکالیں گے۔ اب طوطا شاخ سے اتر کر ریان کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

اتنی ضد کرتے ہو تو بتا دیتا ہوں۔ ریان نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں! بتاؤ بتاؤ!۔ طوطے کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔

ارے میاں مٹھو! بات دراصل یہ ہے کہ میں پچھلے ایک مہینے سے سائیکل سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اب تک نہیں سیکھ پایا۔ ریان نے مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔

بس اتنی سی بات ہے اور تم اتنی دیر سے مایوس بیٹھے ہو! طوطے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارے بھائی! تمھیں یہ چھوٹی سی بات لگ رہی ہے۔ ریان نے طوطے کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور نہیں تو کیا۔ طوطے نے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے کہا۔

یہ چھوٹی سی بات ہے۔ ریان نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

پہلے یہ بتاؤ میں تم سے تمہاری زبان میں بات کر رہا ہوں یہ بڑی بات ہے یا نہیں۔ طوطے نے درخت پر چونچ مارتے ہوئے کہا۔

ارے بھائی! یہ تو عام بات ہے۔ ریان نے جواب دیا۔

جس طرح میرا تمھاری زبان میں بات کرنا ایک عام بات ہے، اسی طرح تمھارا اب تک سائیکل نہ سیکھ پانا ایک عام بات ہے، میں نے بہت کوشش کے بعد تمھاری زبان میں بات کرنا سیکھا ہے، صرف ایک مہینے میں نہیں بلکہ ایک لمبے عرصے میں۔ طوطے نے کہا۔

کیا تم پہلے انسانوں کی بولی نہیں بول پاتے تھے۔ ریان نے حیرت سے پوچھا۔

نہیں! نہیں! بالکل نہیں، میں نے کوشش کر کے سیکھا ہے۔ طوطے نے ہلکے انداز میں جواب دیا اور ریان کے کاندھوں پر آ کر بیٹھ گیا

اچھا..... تو یہ بات ہے۔ ریان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہاں! ہاں! ایسا ہی ہے..... تم کوشش کرتے رہو، ہمت نہ ہارو، ضرور ایک دن سائیکل چلانا سیکھ جاؤ گے، کیا تم نے نہیں سنا ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

ہاں! ہاں! میں نے سنا ہے، اب میں ہمت نہیں ہاروں گا، ضرور سیکھ کر رہوں گا اور ہر چیز سیکھوں گا اور کبھی بھی ہمّت نہیں ہاروں گا۔

■

Shadab Ibrahim
A&po. Bauram .Via. Biraul .Ps.Jamalpur.
Distt.Darbhanga (Bihar) 847203
9304786489
ibrahimmdshadab786@gmail.com

ناهید ندیم

کہانی

باغبان

اتوار کا دن تھا۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے انعم کی آنکھ آج دیر سے کھلی۔ اس کا چھوٹا بھائی انظر ابھی تک سو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر امی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے وہیں سے آواز لگانی شروع کر دی ''امی... امی... ''آپ کہاں ہیں؟''

اسی وقت اس کی والدہ گیلے ہاتھ صاف کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''ہاں بیٹا کیوں چلا رہی ہو؟''

''امی... آج مجھے خالہ کے گھر جانا ہے۔ آپ بھی چلیے نا میرے ساتھ۔'' انعم نے مچلتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا... میں نہیں جا سکتی مجھے آج گھر میں بہت کام ہے'' امی نے اپنی مجبوری بتائی۔

انعم مہینے میں ایک دو بار اپنی خالہ کے یہاں ضرور جاتی تھی۔ وہاں اس کا دِل بہت لگتا تھا، کیونکہ خالہ کے بچے اس کے ہم مزاج تھے۔

سب بچے مل کر طرح طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ ''ایسا کرو... تم اپنے ابّو کے ساتھ چلی جاؤ'' اُس کی والدہ نے کہا۔

انعم مان گئی۔

جیسے ہی انعم اور اس کے ابو اس کی خالہ کے گھر کے نزدیک پہنچے، بے اختیار اُس کی نظر میونسپل پارک پر پڑی جو کہ کافی ہرا بھرا نظر آ رہا تھا۔ اس میں گلاب اور دوسری قسم کے پھول کھلے رہتے تھے، موگرے کی کلیوں کی خوشبو تو چاروں طرف مہکتی رہتی تھی، جس سے آس پاس کی فضا بھی معطر ہو جاتی تھی۔ انعم پارک کے پاس آ کر لمبے لمبے سانس لیتی جیسے کہ وہ خوشبو کے ہر احساس کو اندر اُتارنا چاہتی ہو۔

انعم جب بھی اپنی خالہ کے گھر آتی تو اپنے خالہ زاد بہن بھائیوں کے ساتھ میونسپل پارک میں ضرور آتی تھی۔ وہاں اسے ایک ادھیڑ عمر کا شخص ضرور ملتا جو کچھ نہ کچھ کام کر رہا ہوتا تھا۔ کبھی وہ پیڑ پودوں کو پانی دے رہا ہوتا، تو کبھی کبھی اُن کی کاٹ چھانٹ کرتا ہوا نظر آتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ شخص میونسپل پارک کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ پارک کے پاس ہی اس کا گھر تھا۔

سب لوگ اس کو شاہ صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔

خالہ کے گھر سب سے ملکر انعم آدھے گھنٹے بعد ہی پارک پہنچ گئی، ساتھ میں اس کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جو اس سے چھوٹا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس نے پارک کا ایک چکر لگایا اور چپکے سے اس شخص کی نظر بچا کر گلاب کے دو پھول توڑ کر اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیے اور یہ بھی خیال رکھا کہ اس کا خالہ زاد بھائی احتشام نہ دیکھ لے ورنہ وہ گھر جا کر اس کی شکایت خالہ سے لگا دیتا۔

ایک گھنٹے کے بعد انعم خالہ کے گھر پارک سے لوٹ آئی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اُس کے ابّو واپس چلے گئے اور انعم اپنے خالہ زاد بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہوگئی۔ ایمن سے اس کی خوب بنتی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے ڈھیروں باتیں کیں اور بہت اچھا وقت گزارا۔

شام کو اس کے ابو جب لینے آئے، تو خالہ سے پھر آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر چلی آئی۔ دِن بیتنے لگے اور انعم پڑھائی میں مشغول ہوگئی اور پھر امتحان سر پر آگئے تو مصروفیت اور بڑھ گئی۔ اس وجہ سے اُس کا خالہ کو گھر آنا جانا کم ہو گیا۔ بڑی کلاس میں داخل ہوئی تو مصروفیت اور بڑھ گئی۔ کبھی خالہ بھی آ جاتی اور نہ آنے کی شکایتیں ہونے لگتیں۔

آج لگ بھگ ایک سال کے بعد وہ اپنی خالہ کے گھر آئی تھی۔ جیسے ہی وہ خالہ کے گھر کے نزدیک پہنچی اُس کی نظر ہمیشہ کی طرح میونسپل پارک پر پڑی، مگر یہ کیا... پارک ویران سا دِکھائی دے رہا تھا۔

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا ''یہ کیا ہوا؟''

نہ اس میں رنگ برنگے پھول کھلے تھے نہ کہیں صاف صفائی نظر آ رہی تھی۔ گھاس بھی کافی بڑھی ہوئی تھی اور... وہ شخص بھی کہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ خالہ کے گھر سے ہو کر جلد ہی پارک میں پہنچ گئی، آج وہ اکیلی آئی تھی۔ وہ پارک کے اندر داخل ہوئی۔ قریب ہی دو شخص کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے پارک اندر گھومنا شروع کیا مگر اُس کا دل نہ لگا۔ کیاریاں سوکھی پڑی تھیں۔

کئی پودوں کی ٹہنیاں بھی سوکھ رہی تھیں جیسے کافی دِنوں سے کسی نے پارک کی دیکھ بھال کی نہ ہو۔ پارک اُجڑا سا نظر آ رہا تھا۔

جیسے ہی انعم ان دو آدمیوں کے پاس سے گزری تو اُن کی باتیں اس کے کان میں پڑیں ''بڑے ہی بھلے اِنسان تھے شاہ صاحب''

''بغیر کسی لالچ اور اجرت کے انھوں نے پارک کی دیکھ بھال کی، کتنا خیال رکھتے تھے۔ وہ تھے تو بہار تھی اِس پارک میں'' دوسرے شخص نے بھی کہا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔

''ٹھیک کہا... شاہ صاحب کے اس دنیا سے جانے کے بعد کوئی بھی اس پارک کی دیکھ بھال کرنے کو تیار نہیں۔'' پہلے شخص نے کہا۔ یہ سب سن کر انعم اُداس ہوگئی۔ خالہ کے گھر بھی اس کا دِل نہ لگا، ان سب کے روکنے باوجود بھی وہ وہاں سے گھر جلدی ہی لوٹ آئی۔ گھر آ کر اس نے اپنی امی سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

''بیٹے جس باغ کا مالی نہ ہو وہ باغ جلد ہی اُجڑ جاتا ہے'' انعم کی امی نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

تب انعم کی سمجھ میں آیا کہ اِس پارک کا باغباں اس دنیا سے جا چکا ہے اور باغباں کے بغیر باغ کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

■

Naheed Nadeem
H.No 228/12 Shakoor Basti
Near Milkh Road
MALERKOTLA-148023 (Punjab)
Mob.: 9888856914

حقانی القاسمی

الفاظ ہند

یادیں زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں، یادوں کے بہت سارے رنگ ہوتے ہیں جو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ذات اور ذہن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگر یہ یادیں بچپن سے جڑی ہوئی ہوں تو عمر کے آخری پڑاؤ میں اس کی یاد بہت ستاتی ہے۔ زندگی کا وہ پہلا پڑاؤ بہت یاد آتا ہے اور اس سے جڑی ہوئی ساری ساعتیں ذہن کے پردے پر رقص کرتی رہتی ہیں کیونکہ زندگی کا سب سے خوبصورت مرحلہ وہی ہوتا ہے جب بچہ ہر طرح کی فکر سے آزاد پرندوں، پہاڑوں، تالابوں، جھیلوں، ندیوں سے اپنا ذہنی رشتہ جوڑتا ہے۔ فطرت کی بوقلمونی اس کے ذہن اور دل کو متاثر کرتی ہے۔ کوئل کی کوکو، پپیہے کی پیہو پیہو جب کانوں میں گونجتی ہے تو ذہن کے موسم بھی بدل جاتے ہیں اور ایک عجب سی فرحت اور انبساط کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ موسم خزاں میں بچپن کی بہاروں کو اپنے ذہن میں زندہ رکھتے ہیں اور عہد طفلی کی شوخیوں اور شرارتوں سے اپنی محرومیوں اور اداسیوں کا مداوا بھی کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس کی آنکھوں میں بچپن کا سنہرا دور روشن نہ رہتا ہو۔ ہمارے ادب میں بھی بچپن کی یادوں کو محفوظ رکھنے کی ایک پرانی روایت رہی ہے، جس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کی نسل اس سے تحریک اور ترغیب حاصل کرتی ہے اور اپنے بزرگوں کو اپنا اسوہ بنا کر اپنی زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے کیونکہ وہ صرف بچپن کی یادیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں جو بچوں کو نئی راہ، نئی منزل اور نئے امکانات سے آشنا کرتے ہیں۔

کامٹی (مہاراشٹر) سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'الفاظ ہند' نے اسی بچپن کو اپنا موضوعی محور و مرکز بنا کر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے تاکہ ہماری نئی پود کو روشنی ملے اور وہ بھی اپنے بڑوں کی طرح جریدۂ عالم پر اپنی کامیابی اور کامرانی کی تاریخ رقم کر سکیں۔

مشاہیر ادب کے بچپن کے تعلق سے یہ واقعی ایک منفرد تجربہ ہے جس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ اس میں زیادہ تر قلمکاروں نے اپنے بچپن کے واقعات، مطالعات، دلچسپیاں، سرگرمیاں اور دیگر کوائف اور تجربات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

سلام بن رزاق، ظہیر قدسی، حشمت کمال پاشا، وکیل نجیب، مشتاق احمد نوری، محمد ایوب، غضنفر، نعیمہ جعفری پاشا، رونق جمال، محمد اظہر حیات، اقبال حسن آزاد، ابوذر، ایم مبین، محمد اسد اللہ، محمد رفیق اے ایس، انور مرزا، محمد سراج عظیم، شجاع الدین شاہد، شارق اعجاز عباسی، محمد علی صدیقی، عائشہ سمن، خان نوید الحق انعام الحق، فرخندہ ضمیر، جاوید نہال حشمی، شیخ طاہرہ عبدالشکور، سید محمد نعمت اللہ، شیریں دلوی، انیس رشید خاں، محمد شاہد اجمل، سید اسماعیل گوہر، انصار احمد معروفی، خان حسنین عاقب، ہاشمی سید شعیب قمر الدین، رخسانہ نازنین، سید اسد تابش، پینٹر نفیس، وجاہت عبدالستار، پرویز انیس، ریحان کوثر، محمد نجیب پاشا، تبسم اشفاق شیخ، تفضّل جمال، محمد علیم اسماعیل، فردوس انجم، محسن ساحل، فریدہ تبسم، تسنیم فرزانہ، صبا شاداب وغیرہ کی تحریریں شامل ہیں۔ یہ وہ ادیب و شاعر ہیں جن کا ادب اطفال سے بھی رشتہ ہے اور انھوں نے اپنے اسکول، اساتذہ اور دیگر قیمتی یادوں کو اتنے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے بچپن کے سارے لمحے روشن ہو جاتے ہیں۔ عائشہ سمن کی ایک نظم کا عنوان ہے 'بچپن کی یادیں' جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

بچپن میرا خوب سہانا   ناز اٹھاتے نانی نانا

اوراس کا آخری مصرعہ ہے۔

عمر نہ چاہوں پچپن، چھپن   یارب! بس لوٹا دے بچپن

یہی خواہش ہرانسان کے دل میں ہوتی ہے کہ بچپن کا سہانا دور واپس آجائے کیونکہ بچپن سے زیادہ خوبصورت کوئی زمانہ نہیں ہوتا اور اسی خوبصورتی میں وہ معصومیت بھی شامل ہے جو قدرت نے بچوں کو خاص طور پر ودیعت کی ہے۔

خان حسنین عاقب لکھتے ہیں ''بچپن تو عجیب ہوتا ہی ہے! اسی لیے تو بچے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ معصوم، بے لاگ، بے باک اور بے لوث۔ بچپن کی اپنی ایک الگ ہی تعریف Definition ہوتی ہے۔ اس میں بےفکری ہوتی ہے اور چین سکون ہوتا ہے، معصومیت ہوتی ہے اور شوخی و شرارت ہوتی ہے، بے باکی ہوتی ہے اور بے غرضی ہوتی ہے یعنی ہر اعتبار سے بچپن، بچپن ہوتا ہے۔''

لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے، اسی لیے اب وہ بچپن بھی بچپن نہیں رہا، وقت نے ہم سے ہمارا بچپن چھین لیا ہے۔ بچپن کے سنہرے خواب سلب کرلیے ہیں، اب نہ پہلے جیسی شوخی و شرارت ہے اور نہ بےفکری۔ اب تو بچوں کے چہروں پر بھی بڑھاپا پھیلتا ہوا سا نظر آتا ہے۔ مادی وجود نے اخلاقی وجود کو اتنی بری طرح سے متاثر کیا ہے کہ اب وہ اخلاقیات بھی نہیں رہیں جو ہمیں بچپن میں سکھائی جاتی تھیں۔ صارفی معاشرت کا منفی پہلو ہے، جس نے ہم سے بچپن کی ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔

اس مجلّے میں بزرگوں کے بچپن کے بھی کچھ واقعات ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے ہمیں روشنی بھی ملتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم نے اپنے بچپن کا قیمتی وقت فضول کاموں میں ضائع کردیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کے حوالے سے ان کی

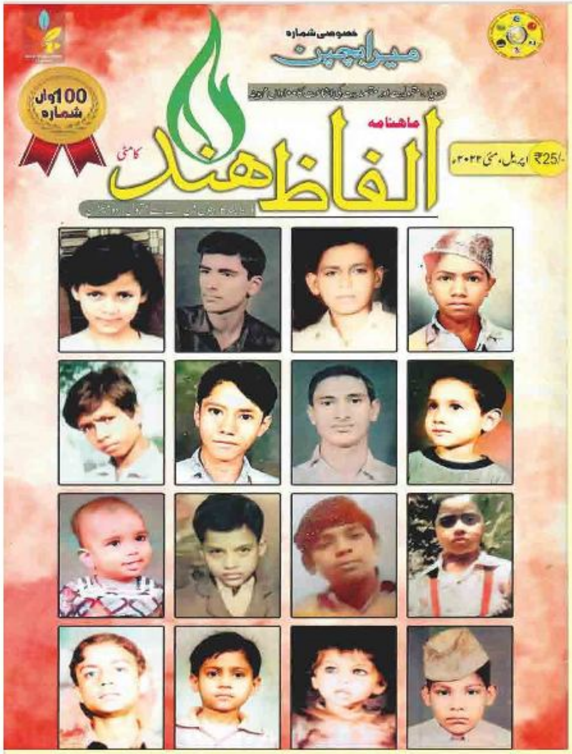

الفاظ ہند (اپریل-مئی 2022)، مدیر: ریحان کوثر، صفحات: 100، قیمت: فی شمارہ: 25 روپے، رابطہ: دفتر ماہنامہ الفاظ ہند، کاشانۂ کوثر، ڈاکٹر شیخ بنکر کالونی، کامٹی-441001 ضلع ناگپور، مہاراشٹر

بہن لکھتی ہیں ''سچ تو یہ ہے کہ مولانا آزاد نے بچپن نہیں دیکھا، چھ سات سال کی عمر سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ننھے ننھے کاندھوں پر ایک سر ہے جس میں ایک بڑا اونچا دماغ ہے۔''

رسالے کے مدیران ریحان کوثر، ریاض احمد امروہوی اور دیگر معاونین قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے 'میرا بچپن' کے عنوان سے 'الفاظ ہند' کا ایک دستاویزی شمارہ شائع کیا اور اس میں انھوں نے ایک اچھی کوشش یہ بھی کی ہے کہ بہت سے قلمکاروں کے بچپن کی تصاویر بھی شامل کی ہیں۔

■

Haqqani Al-Qasmi
B-145/8, 4th Floor, Thokar No.: 8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9891726444

لے وائسر کے کارنامے اور عناصر کی تلاش

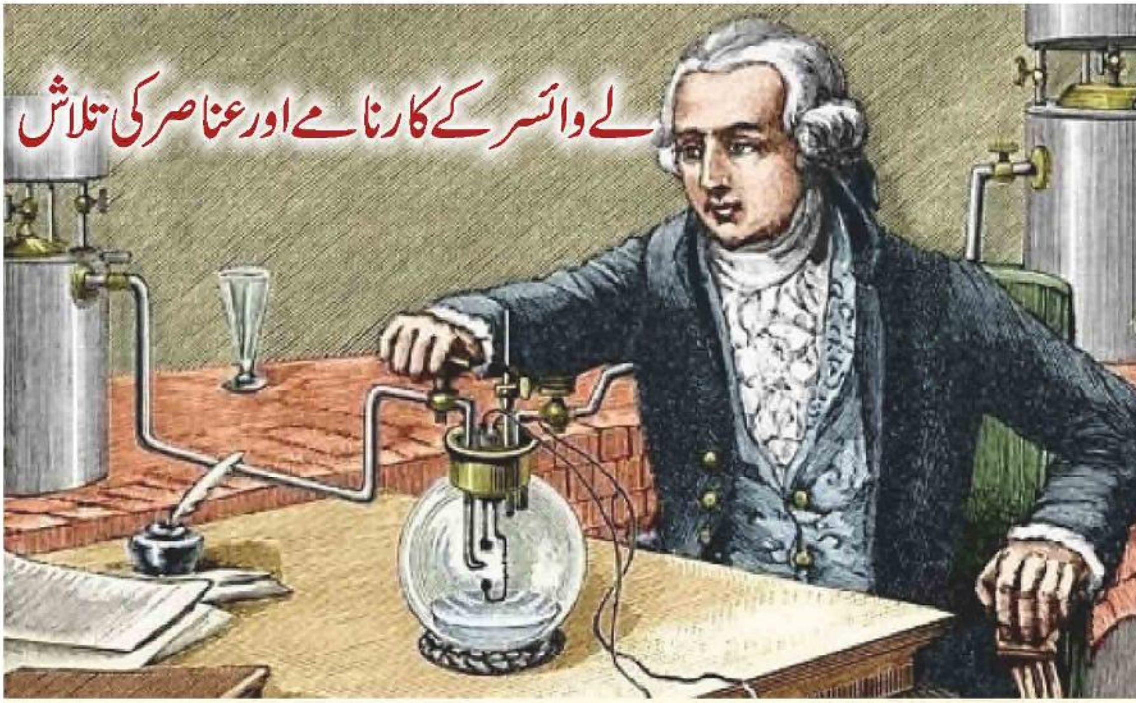

لے وائسر کے کارنامے

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ آکسیجن کی دریافت کسی ایک نے نہیں بلکہ تین مختلف سائنس دانوں نے کی، جو تین الگ الگ ملکوں کے باشندے تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے لگ بھگ ایک ہی وقت میں یہ دریافت کی۔ سب سے پہلا تو کارل شیل تھا، دو ایک سال کے بعد انگلستان کے ایک سائنس داں جوزف پریسٹ لے Joseph Priestley نے شیل کے تجربوں کا حال سنے بغیر اپنے طور پر ہی یہ گیس دریافت کی۔ چند مہینوں بعد فرانس کے ایک سائنس داں لے وائسر Lavoisier نے اس گیس پر تجربے شروع کیے۔

لے وائسر نے تجربے میں ایک ایسی چیز سے مدد لی جو شیل کے پاس بھی موجود تھی اور جوزف پریسٹ لے کے پاس بھی مگر ان دونوں نے اس کی پوری اہمیت نہیں پہچانی تھی اور وہ چیز تھی ترازو!

لے وائسر کی یہ عادت سی ہوگئی تھی کہ کیمیا کے جو بھی تجربے وہ کرتا، اس کا وزن کر لیتا اور پھر تجربے کے بعد وزن بڑھ جاتا تو وہ کہتا:

”اس چیز کا وزن بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیمیائی عمل کے دوران میں اس میں کوئی چیز شامل ہوگئی۔“ یا پھر اس طرح کہتا ”اس کے وزن کم ہوجانے کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں سے کوئی چیز باہر نکل گئی۔“

شیل ہی کی طرح لے وائسر نے بھی خالی صراحی میں فاسفورس بند کر کے جلایا، لیکن ہوا کا پانچواں حصہ غائب ہوجانے پر دماغ پر زور ڈالنے کے بجائے اس نے اپنے ترازو سے سوال پوچھا اور ترازو نے ٹھیک ٹھیک جواب بھی دیا۔

ہوا یہ کہ صراحی میں فاسفورس ڈالنے سے پہلے لے وائسر نے اس فاسفورس کے ٹکڑے کا بڑی احتیاط سے وزن کر لیا، پھر اسے صراحی کی ہوا میں جلانے کے بعد سفید رنگ کا جو سفوف صراحی کے چاروں طرف جم گیا تھا اسے جمع کر کے

اس سفوف کا وزن معلوم کیا پھر اس نے آپ سے پوچھا۔

''کون سا وزن زیادہ ہوگا؟ فاسفورس کا، جلنے سے پہلے یا اس کے بعد، اس سفید رنگ کے سفوف کا جو صراحی کے اندر سے حاصل کیا گیا؟''

اس زمانے میں جس کسی سے یہ بات پوچھی جاتی، ایک ہی جواب ملتا۔ خود شیل بھی یہی کہتا کہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہوئی، ظاہر ہے فاسفورس سے جب فلوجس ٹن باہر نکل آیا، تب وہ سفوف بنا۔ اس لیے سفوف کا وزن فاسفورس سے کم ہوگا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ فلوجس ٹن کا کوئی وزن ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کی روح کی طرح وہ بھی بغیر وزن کے ہے تو اس حالت میں سفوف کا وزن، فاسفورس کے وزن کے برابر رہے گا۔

لیکن لے وائسر کی ترازو نے اس ساری منطق کو باطل کردکھایا۔ سفید سوف کا وزن فاسفورس کے وزن سے زیادہ نکلا۔

اب اس کا کیا جواب تھا؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی ہم سے کہے کہ خالی گھڑے کا وزن پانی کے بھرے گھڑے سے زیادہ ہوگا!

لے وائسر کی جان مصیبت میں آ گئی۔ چاروں طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہوگئی، ہر آدمی نے پوچھنا شروع کردیا ''لیکن حضرت یہ تو بتایئے کہ سفید رنگ کے سفوف کا وزن بڑھ کیسے گیا؟ کون سی چیز کا اس میں اضافہ ہوگیا؟''

''ہوا کے ایک حصے نے فاسفورس سے مل کر اسے سفوف بنایا، اس لیے سفوف کا وزن بڑھ گیا۔'' لے وائسر نے بڑے اطمینان کے ساتھ ان لوگوں کو جواب دیا ''ہوا کا جو حصہ کسی چیز کے جلنے کے بعد غائب ہوتا نظر آتا ہے، دراصل غائب نہیں ہوتا ہے بلکہ جلنے والی شے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ سفید رنگ کے سفوف کا وزن جتنا فاسفورس سے زیادہ ہوتا ہے اس کے برابر غائب ہونے والی ہوا کا وزن ہوتا ہے۔''

بات صاف ہوگئی۔ فلوجس ٹن کے نظریے کا جنازہ نکل گیا! جو لوگ فلوجس ٹن کو مانتے چلے آئے تھے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

لے وائسر نے بہت جلد سمجھ لیا کہ جو بات فاسفورس کے جلانے سے پیدا ہوتی ہے وہی دوسری چیزوں کو جلانے سے بھی ہوگی بلکہ اس کے تجربوں نے تو یہ بھی بتا دیا کہ جب کسی دھات میں زنگ لگ جاتا ہے تو بھی بالکل وہی بات ہوتی ہے جو کسی چیز کے جلنے سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی چیز جل جائے یا کسی دھات میں زنگ لگ جائے تو کیمیا کی زبان میں کہا جائے گا کہ بات ایک ہی ہوئی۔ لے وائسر نے اسے ثابت کردکھایا۔ اس نے کانچ کی ایک بوتل میں ٹن کا چھوٹا سا ٹکڑا ڈالا اور بوتل کو اس طرح بند کیا کہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر جانے نہ پائے۔ پھر اس نے بڑا سا آتشی شیشہ لیا اور اس کے ذریعے سورج کی تیز کرنوں کو ٹن پر مرکوز کیا۔ وہ ٹکڑا اتنا گرم ہوگیا کہ کچھ دیر بعد پگھل گیا اور سرمئی رنگ کا سفوف سا بن گیا بالکل اسی طرح جیسے ٹن میں زنگ لگ کر بن جاتا ہے۔

تجربے سے پہلے لے وائسر نے اپنی عادت کے مطابق ٹن کا وزن کرلیا تھا اور بوتل کے اندر کی ہوا کا بھی۔ تجربے کے بعد اس نے سرمئی سفوف کا وزن معلوم کیا اور بوتل میں جو ہوا کا حصہ باقی رہ گیا تھا اس کا بھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو پہلے سمجھ چکا تھا۔ بوتل کی ہوا کے وزن میں جتنی کمی آ گئی تھی ٹھیک اسی قدر سفوف کا وزن ٹن کے وزن سے بڑھ گیا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ بوتل کے اندر سورج کی کرنوں کے سوا اور کوئی چیز داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ٹن میں زنگ لگنے کے بعد اس کا وزن کیسے بڑھ گیا اور ہوا کا وزن کیسے ہوا؟ جواب وہی تھا ٹن کے ساتھ ہوا کا وہ حصہ جسے ہم جاندار ہوا کہہ چکے ہیں، مل گیا، اس سے

زنگ لگا۔ یہی وجہ ہے کہ زنگ آلود ٹن کا وزن بڑھ گیا۔

لے وائسر نے ایک اور تجربے سے اپنی بات پکی کر لی۔ اس نے لکڑی کا خالص کوئلہ لے کر اس کا وزن کیا۔ ایک برتن میں جاندار ہوا بھر کر کوئلہ جلایا۔ کوئلہ بڑی تیز روشنی کے ساتھ جلتا رہا یہاں تک کہ بالکل جل گیا اور اس کا نشان بھی باقی نہ رہا۔ جلنے کے بعد کوئلہ کیا ہوا؟ ختم ہو گیا؟ لے وائسر نے اپنے ترازو پر برتن کا اب جو دوبارہ وزن کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے کی بہ نسبت اس کا وزن ٹھیک اتنا ہی بڑھ گیا ہے جتنا کہ کوئلے کا وزن تھا۔ مطلب ہے نہ تو کوئلہ ختم ہوا نہ غائب ہوا بلکہ جلتے وقت وہ جاندار ہوا کے ساتھ ملتا گیا اور برتن میں اب اس مرکب سے ایک نئی چیز تیار ہو گئی جسے لے وائسر نے 'کاربونک ایسڈ گیس' کا نام دیا۔

لے وائسر نے جب اپنے تجربے اس زمانے کے سائنس دانوں کے سامنے دہرائے تو اس پر آفت ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ! کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ ایک شے جلنے کے بعد ضائع نہیں ہوتی بلکہ ایک نئے مرکب میں بدل جاتی ہے۔ کوئی یہ تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ دھات کو زنگ لگنے کے بعد نیا مرکب بن جاتا ہے۔ لے وائسر نے ان باتوں کا مقابلہ کیا۔ اس کو اپنے ترازو پر پورا بھروسہ تھا جو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ فلوجسٹن نہ تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور نہ کسی اور نے۔ اس لیے اسے وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا اور تیار بھی کیسے ہوتا جب خود اس کے ذاتی مشاہدے دوسرے نتیجے بتا رہے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد اعتراض کرنے والوں کا زور دھیما پڑنے لگا، جنھیں لے وائسر کے ترازو پر شک تھا، وہ خود بھی اپنے ترازو پر وہی تجربے دہرا کر اسی نتیجے پر پہنچے اور آخر انھیں کہنا پڑا ''لے وائسر نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔''

عناصر کی تلاش

جب فلوجسٹن کی بات ختم ہو چکی اور 'جاندار ہوا' کی بات پکی ہو گئی تو کیمیا کا سائنس ایک نئے راستے پر لگ گیا۔ اب تک حکیم، فلسفی اور سائنس داں یہی سمجھتے تھے کہ دنیا میں صرف چار عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مٹی ہیں اور انھیں 'عناصر اربعہ' (اربع = چار) کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سب چیزیں انھیں چار عنصروں سے مل کر بنتی ہیں، لیکن شیل اور لے وائسر کے تجربوں کے بعد یہ سائنس داں بھی سر کھجانے لگے اور سوچنے لگے کہ اصل میں عنصر کن چیزوں کو مانا جائے؟ اب فاسفورس بھی عنصر بن گیا، اس کے جلنے کے بعد جو سفید رنگ کا

سفوف ملا وہ مرکب کہلایا، یعنی فاسفورس اور جاندار ہوا کا مرکب۔ اسی طرح کاربن عنصر مانا گیا اور کاربونک ایسڈ گیس، کاربن اور جاندار ہوا کا مرکب کہلایا۔ لے وائسر نے اعلان کیا کہ سارے دھات تو عنصر ہیں لیکن ان پر جو زنگ جم جاتا ہے وہ اس دھات اور جاندار ہوا کا مرکب ہوتا ہے۔ دھاتوں کے علاوہ جاندار ہوا اور بے جان ہوا بھی اپنی جگہ عنصر بتائے گئے۔ 'جاندار ہوا' کو لے وائسر نے آکسیجن کا نام دیا۔ آکسیجن کے معنی ہیں 'تیزاب بنانے والا'۔ فاسفورس، آکسیجن کے ساتھ مرکب بن کر جو سفید سفوف بناتا ہے، وہ تیزابی ہوتا ہے۔ کاربن بھی آکسیجن کے ساتھ مرکب بن کر کاربونک ایسڈ گیس، ایک تیزابی گیس بناتا ہے۔ لے وائسر نے ہوا کے دوسرے حصے یعنی 'بے جان ہوا' کو ایزوٹ کا نام دیا۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں 'بے جان' بعد میں اسے 'نائٹروجن' کا نام دیا گیا۔

اس وقت تک لوگ پانی کو بھی عنصر ہی سمجھتے تھے۔ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے اپنے علم کے مطابق عنصروں کی جو فہرست بنائی تھی، اس میں سب سے پہلے ہوا اور پانی کا نام لکھا تھا مگر اب وہ جان گئے کہ ہوا ایک عنصر ہونے کے بجائے دو عنصروں، گیسوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس علم سے ٹھیک دس سال کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ پانی ایک عنصر نہیں ہے، بلکہ دراصل مرکب ہے۔ اس کا پتا چلانے والا پہلے تو انگلستان کا ایک باشندہ کیونڈش تھا اور بعد میں ہمارے دوست لے وائسر نے بھی یہی بات بتائی۔

اب ذرا سوچیے کہ اس زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ پانی دو گیسوں کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک آکسیجن ہے اور دوسری گیس ہائڈروجن ہے۔

'ہائڈروجن' کے معنی ہیں 'پانی بنانے والا' اس خبر سے سائنس کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ کہتے ہوں گے، یا اللہ! دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ صدیوں سے جو باتیں ہم مانتے چلے آئے ہیں اب وہ الٹی ہو رہی ہیں۔ بعض لوگ شاید اس بنا پر یہ بھی سمجھنے لگے ہوں گے کہ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں مگر جو لوگ خدا کی قدرت کو زیادہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے ان کو ایسی خبروں سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

لے وائسر نے پرانے چار عناصر کا خیال چھوڑ کر تیس عنصروں کی نئی فہرست تیار کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں جتنی اشیا دکھائی دیتی ہیں وہ سب کی سب ان تیس میں سے ایک یا دو یا اس سے زیادہ عنصروں سے مل کر بنی ہوئی ہیں، لیکن اس پر بھی لے وائسر کا دل مطمئن نہ تھا، اسے اپنی فہرست پر اکثر شک ہوتا رہا۔

ایک جگہ اس نے لکھا ہے ''میں ان تیس اشیا کو عنصر اس لیے مانتا ہوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو دوسری سادہ چیزوں سے اب تک علاحدہ نہیں کیا جا سکا ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ان میں کئی چیزیں مفرد عنصر کے بجائے مرکب ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب کیمیا داں ایسے طریقے معلوم کر لیں گے جن سے مرکب کے اجزا الگ کیے جا سکیں گے۔ جیسا کہ ہوا اور پانی کے بارے میں ہوا۔''

لے وائسر کی یہ پیشین گوئی بہت جلد حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

■

ماخذ: کیمیا کی کہانی: سید شہاب الدین دسنوی، **چوتھی طباعت:** 2009، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کپتان لطافت حسین خان (علیگ)

ملیریا

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک   تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

وہ کون ہے جس کے ظلم سے امیر غریب چھوٹے بڑے سب پناہ مانگتے ہیں۔ جس نے بڑے بڑے سورماؤں اور تاجداروں کو پچھاڑ کر ایک لحظہ میں چت کر دیا ہے۔ جس کے اثر سے ہٹے کٹے چلتے پھرتے آدمی ہانپتے کانپتے پلنگ پر منہ چھپا کر لیٹ جاتے ہیں۔ جو کنجوس مکھی چوس قرض خواہ کی طرح اپنے وقت معین پر آکر زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جن بھوت کی طرح سر پر سوار ہو کر اس زور سے گلا گھونٹتا ہے کہ بڑے بڑے شہزوروں کی آنکھیں نکل پڑتی ہیں۔ بڑے بڑے مضبوط، تنومند شخصوں کی شکل چوسی ہوئی آم کی طرح نکل آتی ہے۔ رگ و ریشے کا ست کھنچ جاتا ہے۔ منہ زرد آنکھیں دھنسی ہوئی قدم لڑکھڑاتے ہوئے، کام کاج سے دل بیزار زندگی بسر کرنے سے مجبور جوش اور ولولے مفقود، دماغی و جسمانی طاقتیں معدوم اس بلائے مبرم کا نام ملیریا ہے لیکن عام طور سے لوگ باری کا بخار کہتے ہیں کیونکہ وہ لرزہ کے ساتھ کبھی ایک دن بیچ کر کے کبھی تیسرے دن بلا ناغہ اپنا روئے سیاہ دکھایا کرتا ہے اور بسا اوقات جان ہی لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ عوام اس کو ایک معمولی بیماری سمجھ کر بے غم اور بے فکر ہو جاتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ وہ متعدی بھی ہے اس کی شدت سے لوگ کبھی مر بھی جاتے ہیں اور اکثر اس کی پیدا کردہ خرابیاں، خون، جگر، تلی و معدہ وغیرہ میں سرایت پذیر ہو کر بالآخر موت کا باعث ہوتی ہیں۔ دیگر وبائیں تو بجلی کی طرح گر

کر جلد کوئی نہ کوئی فیصلہ کر دیتی ہیں لیکن ملیریا کا زہر عموماً کچھ دنوں کے بعد اپنا رنگ لاتا ہے۔ اس کی مار اندرونی ہوتی ہے۔ اس کی صعوبت و مصیبت کا اندازہ ہم کو مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عرصے کے لیے بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی کام کرنے کی قابلیت میں نقص آجاتا ہے۔ نیز قوموں کے نہ صرف جسمانی بلکہ تمدنی مالی و ملکی حالات پر اس کا عظیم الشان اثر پڑتا ہے۔ ایک فلسفی کا یہ خیال کہ ہمارے ملک کے ادبار و تنزل کا بہت بڑا سبب منجملہ دیگر اسباب کے یہ بخار بھی ہوا ہے۔ کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ سلطنت روما کی مثال سامنے موجود ہے جس کے متعلق لوکن اور ویلکھم اپنی نادر تصنیف میں لکھتے ہیں ''پہلی صدی عیسوی میں معاشرت روما کی ناقابل بیان حالت پر نظر ڈالتے ہی گمان ہوتا ہے کہ رومی بیہودہ بھی تھے اور کسی روگ میں بھی مبتلا تھے۔ ان کی قساوت قلب، حد درجہ کی بے رحمی نفسانی خواہشوں کی گرویدگی، عیش و عشرت کے پیچھے اعتدال سے گزر جانا، خودداری و ضبط نفس کو خیر باد کہہ دینا یہ تمام باتیں اسی ایک بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی جسمانی خرابی اس میں ضرور مضمن ہوگی جس نے نسلاً بعد نسلاً اپنے اثر سے قوم کے خواص تک کو بدل دیا تھا اور اس کا اظہار بہ لحاظ مرز بوم اور خصوصیات ذاتی جبر و تعدی کی شکل میں نمایاں ہوا تھا، ہماری رائے میں اس نقص کا پیدا کرنے والا صرف ملیریا ہی ہو سکتا ہے جو ان میں دائماً کثرت سے شائع رہتا تھا۔ آگے چل کے بھی دونوں مصنف ڈاکٹر ہچنس کے کلمات یوں نقل کرتے ہیں۔

اقوام یورپ کا مداری اور زیر مداری نو آبادیاں بنانا اور وہاں اپنی تہذیب و تمدن کو پھیلا کر انقلاب عظیم برپا کرنا اگر کہا جائے کہ یہ سب کچھ بغیر ملیریا کا تدارک کیے ممکن تھا تو اس کو محض دروغ سمجھنا چاہیے۔ یورپ کو اپنا تسلط اور غلبہ قائم کرنے میں دو

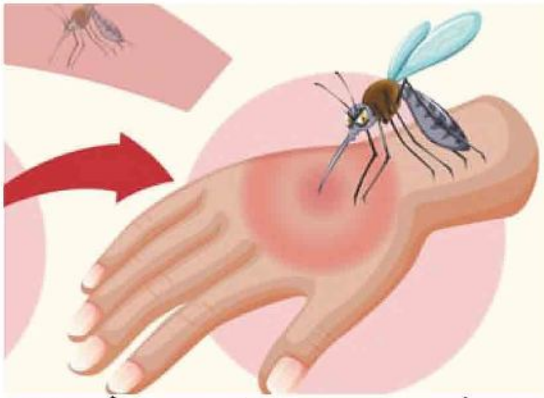

چیزوں نے سب سے زیادہ مدد دی ہے۔ یہ دونوں چیزیں سفوف کی شکل میں ہیں۔ ایک کا رنگ سفید ہے، دوسرے کا سیاہ یعنی کونین اور بارود۔ ظاہر ہے کہ اس بخار نے قوموں کی زندگی پر کتنا بڑا اثر کیا ہے۔ ادبار و تنزل کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں لیکن اگر تندرستی کو برباد کرنے والے اسباب کا لحاظ کیا جائے تو ملیریا کا نمبر اوّل ہے جو شخص اس بیماری کو یہ درجہ دے وہ سخت غلطی پر ہے اور قوانین قدرت کے اصولِ اولیں تک سے نابلد ی کیا اس کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ مشاہدہ کافی نہیں ہے کہ آج کل جن ممالک میں ملیریا نہیں ہے وہی سرتاج عالم سمجھے جاتے ہیں۔

مقامی ملیریا کم و بیش دنیا کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یورپ بہ نسبت دیگر ممالک بہت زیادہ محفوظ ہیں۔ انگلستان میں کسی زمانہ میں تھا اب مفقود ہے۔ جاپان اور آسٹریلیا کا بھی یہی حال ہے۔ جوں جوں بدار یا منطقۂ حارہ کے قریب آتے ہیں اس کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ افریقہ کے مغربی سواحل پر اس کا بڑا زور ہے۔، چین، ملایا، لنکا اور برما میں بھی اس کی شدت ہے۔ ہندوستان میں عالمگیر ہے، خصوصاً بنگال و آسام کے بعض مقامات اس کی کثرت کے لیے مشہور ہیں۔

■

ماخذ: دیباچہ صحت، مولفہ: ڈاکٹر کپتان لطافت حسین خاں صاحب (علیگ)، ناشر: نظامی پریس، بدایوں

لفظوں کو ملا کر لکھنا

ذیل میں مثال کے طور پر، ایسے لفظوں کی (ناتمام) فہرست پیش کی جاتی ہے جن کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔ اس فہرست کے اصل مخاطب طلبہ ہیں، اسی بنا پر اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مختلف قسم کے مرکبات کی اتنی مثالیں ضرور جمع کر دی جائیں کہ وضاحت کا حق ادا ہو جائے۔ اس فہرست کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

(1)

بے اثر، بے باق، بے باک، بے باکی، بے بدل، بے بس، بے بسی، بے بصر، بے بہرہ — بے تاب، بے تابی، بے تامل، بے ترتیب، بے تکا، بے تکان، بے تکلف، بے تمیز، بے توفیق، بے ٹھکانا، بے ثمر، بے ثبات، بے جان، بے جلد، بے جرم، بے جوڑ، بے چون، بے چارہ، بے چارگی، بے حجاب، بے حجابی، بے حد، بے حساب، بے حرمت، بے حرمتی، بے حس، بے حسی، بے حقیقت، بے حمیت، بے حواس، بے حیا، بے حیائی، بے خبر، بے خبری، بے خرد، بے خواب، بے خوابی، بے خود، بے خودی — بے داغ، بے دلیل، بے دام، بے دخل، بے دخلی، بے درد، بے دردی، بے دریغ، بے درنگ، بے دست و پا، بے دل، بے دم، بے دماغ، بے دماغی، بے دید، بے ڈول، بے ڈھب، بے ڈھنگا — بے راہ، بے راہ روی، بے رحم، بے رحمی، بے رخی، بے رنگ، بے رنگی، بے ریا، بے ریائی، بے زبان، بے زبانی — بے سامان، بے سامانی، بے سر و ساماں، بے سکون، بے سدھ، بے سرا، بے سواد، بے ود، بے شائبہ، بے شرم، بے شرمی، بے شعور، بے شبہ، بے شمار — بے صبر، بے صبری، بے ضابطہ، بے طاقت، بے طاقتی، بے طرح، بے طلب، بے طور، بے عمل، بے علم، بے غرض، بے غرضی، بے عزت، بے عزتی، بے عقل، بے عقلی، بے عنوانی، بے عیب، بے غم، بے غمی، بے غیرت، بے غیرتی، بے فائدہ، بے فکرا، بے فیض، بے قابو، بے قاعدہ، بے قرار، بے قراری، بے قرینہ، بے قصور — بے کام و کاست، بے کراں، بے کرانی، بے کس، بے کسی، بے تاج و تخت، بے کمال، بے گمان، بے گنتی، بے گھرا، بے لگام، بے

لوٹ، بے مایہ، بے مایگی، بے مثل، بے محابا، بے محل، بے مروت، بے مروتی، بے مزہ، بے مصرف، بے معنی، بے منت، بے موت، بے موسم، بے موقع، بے مہار، بے نام، بے نوا، بے نوائی، بے نہایت، بے نقط، بے نیاز، بے نظیر، بے نمک — بے وجہ، بے وقت، بے وقعت، بے وقوف، بے وقوفی، بے وفا، بے وفائی، بے ہنر، بے ہنگم، بے ہنری، بے ہنگام، بے ہوش، بے ہوشی۔

(2)

بہ نظرِ اصلاح، بہ ارادۂ شاگردی، بہ جہت، بہ سبب، بہ شرطے کہ، بہ حسن وخوبی، بہ ہر صورت، بہ ہر حال، بہ خدا، بہ موجب، بہ راہِ کرم، بہ ہمہ وجوہ، بہ دل، بہ یک کرشمہ، بہ خیرو عافیت، بہ سرو چشم، بہ آسانی، بہ افراط، بہ حکم، بہ خوبی، بہ درجہ ہا، بہ دل وجان، بہ ذاتِ خود، بہ صد ادب، بہ قدرِ ضرورت، بہ قیدِ حیات، بہ طرزِ میر، بہ رنگِ غالب، بہ طورِ خود، بہ مراتب، بہ مشکل، بہ غور، بہ ہزار دقت، بہ نفسِ نفیس، بہ دقت، بہ دشواری، بہ کوشِ بسیار، بہ قیمت، بہ عافیت، بہ اعزازِ تمام، بہ ناز و نعمت، بہ اندازِ خاص، بہ کارِ خاص، بہ کارخویش، بہ سواریِ ریل، بہ قولِ خود، بہ خطِّ غالب۔

'بہ' خواہ کسی معنی میں آئے اس کو عموماً علاحدہ لکھا جائے گا۔ البتہ چند لفظ ایسے ہیں جو مفرد لفظ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، ان کو اس قاعدے سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا، جیسے بہم، بغیر، بعینہٖ، بفضلہٖ، بجز، بجائے؛ یہ لفظ مستثنیٰ الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید دو چار اور ایسے لفظ ہوں، بس اس سے زیادہ نہیں۔

(3)

دو لفظوں کے درمیان میں بھی یہ حرف آتا ہے اور اس صورت میں بھی اس کو علاحدہ لکھا جائے گا۔ جیسے:

دم بہ دم، دم بہ خود، روز بہ روز، دن بہ دن، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال، جاں بہ لب، سر بہ سجدہ، زر بہ کف، خنجر بہ دست، نام بہ نام، منزل بہ منزل، جا بہ جا، سر بہ فلک، تن بہ تقدیر، سر بہ کف، رو بہ راہ، رنگ بہ رنگ، نو بہ نو، دست بہ دست، لب بہ لب، خم بہ خم، لحہ بہ لحہ، لحظہ بہ لحظہ، قدم بہ قدم، سر بہ زانو، سر بہ کف، صدا بہ صحرا، سر بہ فلک، پا بہ رکاب، کو بہ کو، شہر بہ شہر، ملک بہ ملک، یم بہ یم، صحرا بہ صحرا، پا بہ گِل، پا بہ زنجیر، حرف بہ حرف، لفظ بہ لفظ، ٹکٹ بہ دست، رو بہ قبلہ۔

نہ کہو، نہ کرتے، نہ جاتے، نہ پوچھو، نہ پوچھ، نہ ہوا، نہ دیکھا، نہ گیا — دیکھیں گے، آئے گا، جائے گا، لکھیں گے، پوچھ لیا، رکھ لیا — پائے گا، پائیں گے، پڑھ لیا، پڑھ لو، پڑھیں گے، پڑھے گا — کہہ دیا، کہہ رہا ہے، کہیں گے، چڑھ گیا، چڑھ جا، چڑھ رہا ہے، پڑھ رہا ہے، پڑھ لیا ہے، آئے گا، آئیں گے، دیکھ لیا، دیکھ رہا ہے، دیکھیں گے، دیکھے گا۔

ان کو، اس کو، مجھ کو، تجھ کو، سب کو، تم کو، ہم کو — اس کا، ان کا، اس کے، ان کے، سب کے — اس نے، سب نے، میں نے، کس نے، تم نے، ہم نے، انھوں نے، جس نے، کس نے، کسی نے، — اس سے، سب سے، مجھ سے، ہم سے، تم سے، ان سے۔ اس میں، مجھ میں، تجھ میں، سب میں۔ اس پر، مجھ پر، تم پر، تجھ پر، ہم پر — جس کا، جس کو، جس سے، جس وقت، جن کا، جن کو، جن سے — جب تک، اب تک، کب تک، مجھ تک

■

ماخذ: اردو املا، مصنف: رشید حسن خاں، **پانچویں طباعت:** 2019،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

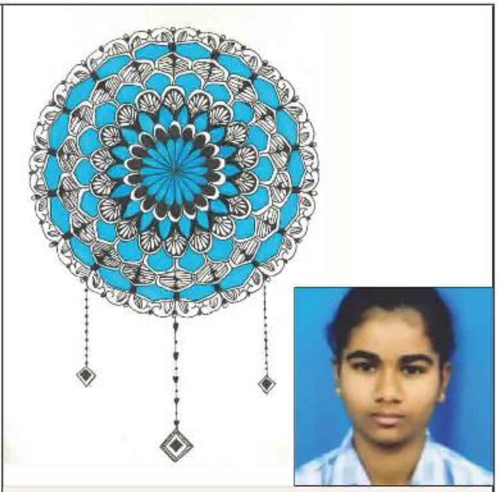

مانسی، درجہ دوازدہم، ہولی چائلڈ سینئر سیکنڈری اسکول، سونی پت، ہریانہ

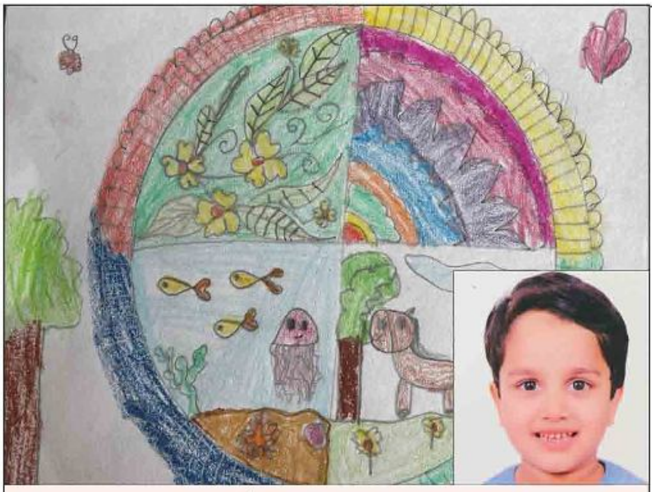

محمد ذہان، درجہ سوم، گیان شری، نوئیڈا، سیکٹر 127، یوپی

محمد مصعب بن مولانا محمد عادل، درجہ نہم، المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول، چکھلی، پونہ، مہاراشٹر

صائمہ صدف سعید احمد انصاری، درجہ 12
گورنمنٹ اردو گرلس، ہائر سیکنڈری اسکول، برہانپور، مدھیہ پردیش

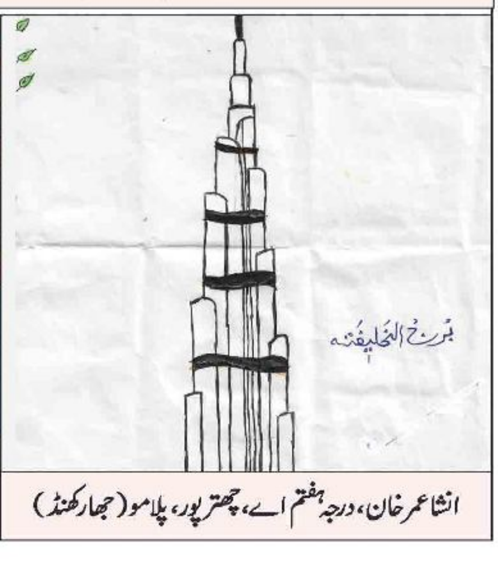

انشا عمر خان، درجہ ہفتم اے، چھترپور، پلامو (جھارکھنڈ)

آئینش دعا علی، درجہ ششم، نعمت اردو اسکول، خلدآباد، مہاراشٹر

صبا فرحین شیخ بصیر، درجہ پنجم، فاطمہ پرائمری اسکول، پربھنی مہاراشٹر

محمد خان ابن محمد مقیم، درجہ چہارم
جامعہ مڈل اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عالیہ اقبال، درجہ چہارم، ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی

ایمن شیخ، درجہ دوم، کوہ نور انٹرنیشنل اسکول، کرلا، ممبئی، مہاراشٹر

بریرہ مشہود، درجہ اوّل، کیندریہ ودیالیہ، انڈریوز گنج، دہلی

شیخ بلال ولد عبداللطیف، درجہ اوّل
اقرا اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے، جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, सितंबर 2022, वर्ष 10, अंक 09
BACHON KI DUNIYA Monthly, September 2022 Vol. 10, Issue: 09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/08/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

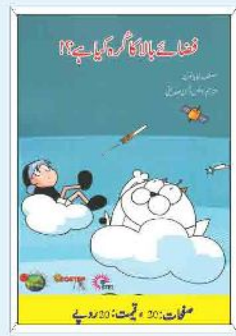

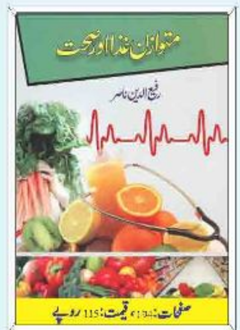

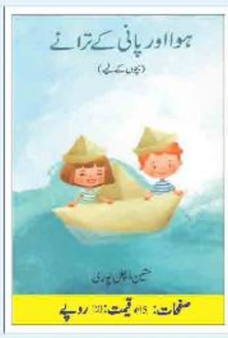

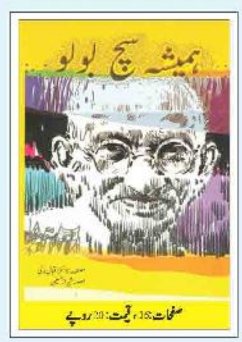

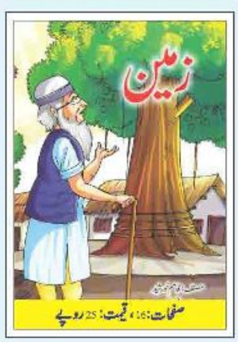

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6